نظام خلافت کیا ہے؟

- **نظام خلافت**، اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کے اعلان و اقرار اور قرآن و سنت کی غیر مشروط بالادستی کے عملی نفاذ کا نام ہے۔
- **نظام خلافت**، اسلامی ریاست کے ہر شہری مسلم ہو یا غیر مسلم، کی جان و مال عزت و آبرو کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔
- **نظام خلافت**، اسلامی ریاست کے ہر شہری کی بنیادی ضروریات یعنی غذا، لباس، رہائش، علاج و تعلیم وغیرہ کا ذمہ دار ہے۔
- **نظام خلافت**، تمام کائنات اور انسانوں کے خالق و مالک کے ابدی پیغام کو تمام دنیا کے انسانوں تک پہنچانے کا اہتمام کرتا ہے۔
- **نظام خلافت**، اسلامی ریاست کے تمام شہریوں کو فوری عدل و انصاف فراہم کرنے کا ضامن ہے۔
- **نظام خلافت**، میں مردوں اور عورتوں کے الگ الگ دائرہ کار معین ہیں۔ یہ نظام عورت کو پورا اختیار دیتا ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی قائم کردہ ستر و حجاب کی حدود کو پیش نظر رکھتے ہوئے بوقت ضرورت کاروبارِ حیات میں شرکت کر سکے۔
- **نظام خلافت**، عورتوں کی عزت و ناموس کا محافظ اور حقوق نسواں کا پاسبان ہے۔
- **نظام خلافت**، نہ صرف یہ کہ تمام انسانوں کی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام اس نقطۂ نگاہ سے کرتا ہے کہ وہ اپنے مقصد حیات سے آگاہ ہوں، بلکہ اس کے مطابق ان کی رہنمائی اور مدد بھی کرتا ہے۔
- **نظام خلافت**، مسلمانوں کے دلوں میں جذبۂ جہاد کی روح بیدار کرنے کا ضامن بھی ہے تاکہ حزب الشیطان کے حملوں کا مؤثر جواب دیا جا سکے۔

خلاصہ کلام:

نظامِ خلافت کا قیام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے!

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

سہ ماہی میثاق لاہور

جلد : ۵۰
شمارہ : ۳
ذیقعد ۱۴۲۱ھ
مارچ ۲۰۰۱ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زرتعاون ۱۰۰/-

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

☆ امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ 22 ڈالر (800روپے)

☆ سعودی عرب' کویت' بحرین' قطر' عرب امارات 17 ڈالر (600روپے)

بھارت' بنگلہ دیش' افریقہ' ایشیا' یورپ' جاپان

☆ ایران' ترکی' اومان' مسقط' عراق' الجزائر' مصر 10 ڈالر (400روپے)

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36- کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700' فون: 03-02-5969501

فیکس: 5834000 ای میل: anjuman@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67- گڑھی شاہو' علامہ اقبال روڈ' لاہور

فون: 6316638-6366638 فیکس: 6305110

ای میل: markaz@tanzeem.org

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ عرضِ احوال _____ ۳

حافظ عاکف سعید

☆ حالات حاضرہ _____ ۴

ملکی و ملی حالات پر امیر تنظیم اسلامی کے تبصروں پر مشتمل پریس ریلیز

ادارہ

☆ تحفہ حدیث _____ ۷

☆ تذکرہ و تبصرہ _____ ۹

جمہوریت' اسلام اور پاکستان

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ توحیدِ عملی (۹) _____ ۳۳

فریضہ اقامت دین سے ربط و تعلق

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ دعوت فکر _____ ۵۵

اللہ قرض سے بچائے

محمد عالم ندوی

☆ خطوط و نکات _____ ۵۹

○ بیعت ـــــ ایک اشکال اور اس کا جواب

○ نصابی کتب میں اہل سنّت کی دلآزاری کیوں؟

☆ فکر عجم _____ ۶۶

پیش گفتار (۳)

ڈاکٹر ابو معاذ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض احوال

۲۳ تا ۲۵ فروری تنظیم اسلامی حلقہ پنجاب و آزاد کشمیر کا سہ روزہ علاقائی اجتماع لاہور کے ایک مضافاتی قصبے سادھوکی کے نزدیک واقع "فردوسی فارم" میں منعقد ہوا۔ اس سال تنظیم کی مجلس شوریٰ میں کل پاکستان سالانہ اجتماع کی بجائے سہ روزہ علاقائی اجتماعات کے انعقاد کا فیصلہ ہوا۔ یہ بات بھی طے پائی کہ یہ اجتماعات تربیتی نوعیت کے ہوں گے جبکہ ضمنی طور پر خطابات عام کو بھی ان میں شامل کیا جا سکے گا۔

اس سلسلے کا پہلا سہ روزہ اجتماع جو حلقہ ہائے سندھ و بلوچستان کا مشترکہ علاقائی اجتماع تھا' اواخر جنوری میں قرآن اکیڈمی' کراچی میں منعقد ہوا۔ امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ اور مرکزی عاملہ کے ارکان کے علاوہ طے شدہ پروگرام کے مطابق پورے پاکستان سے امراء حلقہ جات اور ناظمین بھی اس اجتماع میں شریک ہوئے ـــــ دوسرا علاقائی اجتماع جو پنجاب کے جملہ حلقہ جات اور آزاد کشمیر کے رفقاء کا مشترک اجتماع تھا' فردوسی فارم کے کھلے میدان میں منعقد ہوا اور بہت سے اعتبارات سے نہایت بھرپور اور کامیاب رہا۔ ان دونوں اجتماعات میں توجہ کا اصل ارتکاز رفقاء کی فکری و ذہنی تربیت پر تھا۔ اہم دینی موضوعات پر تقاریر ہوئیں۔ دینی فکر کی تجدید اور جذبہ عمل کی تازگی کا سامان کیا گیا۔ چنانچہ رفقاء بحمد اللہ اک ولولہ تازہ لے کر ان اجتماعات سے رخصت ہوئے۔ دونوں اجتماعات میں بعض سیشن عمومی نوعیت کے تھے جن میں مقامی لوگوں کو دعوت عام تھی اور ان کے لئے خطابات عام کا اہتمام تھا۔ (فردوسی فارم میں منعقد ہونے والے حالیہ سہ روزہ اجتماع کی تفصیلی رپورٹ "ندائے خلافت" کے تازہ شمارے میں شائع کر دی گئی ہے۔)

اس سلسلے کا تیسرا اجتماع' اگر اللہ نے چاہا تو اپریل کے اواخر میں تیمر گرہ میں منعقد ہو گا۔ یہ جگہ ریاست دیر کا حصہ ہے اور صوبہ سرحد میں شامل ہے۔ یہ اجتماع تنظیم اسلامی کے حلقہ جنوبی سرحد اور حلقہ شمالی سرحد کے رفقاء کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔ پروگرام کے مطابق' امیر تنظیم اسلامی مرکزی عاملہ کے ارکان اور امراء و ناظمین حلقہ جات بھی ان شاء اللہ اس میں شرکت کریں گے۔ اس طرح علاقائی اجتماعات کا یہ راؤنڈ اپنی تکمیل کو پہنچے گا۔ السعی منا والاتمام من اللہ

ملکی، ملی اور بین الاقوامی حالات پر امیر تنظیم اسلامی کا تبصرہ

خطابات جمعہ (مسجد دارالسلام لاہور) کے پریس ریلیز کے آئینے میں

موجودہ حالات میں جشن بہاراں منانا بے غیرتی سے کم نہیں!

۱۶ فروری کا خطاب جمعہ

سابقہ حکمرانوں کی طرح موجودہ فوجی حکومت کی حیثیت بھی آئی ایم ایف، ورلڈ بنک اور نیو ورلڈ آرڈر کے آلۂ کار سے زیادہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نہایت بے رحمی کے ساتھ عوام کا آخری قطرہ تک نچوڑنے پر تلی ہوئی ہے۔ پرویز مشرف بھی نواز شریف اور بے نظیر حکومت کی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرق کو ختم کرنے کے اسلام دشمن ایجنڈے پر عمل پیرا ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک طرف ملک میں پانچ سپورٹس اکیڈمیوں کے قیام جیسی فضول خرچیاں کر کے گویا عوام کے بنیادی مسائل سے لاتعلقی کا اظہار کیا جا رہا ہے جو عالمی مالیاتی استعمار کے ایجنڈے پر عمل کا مظہر ہے۔ دوسری طرف ہندوانہ تہوار بسنت کو سرکاری سطح پر منا کر مشترکہ ہندو مسلم کلچر کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ موجودہ حکومت کی پالیسیوں سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ وہ عوام کو کھیل کود اور لایعنی تفریحات میں مست رکھ کر صیہونیت کے عزائم یعنی دجالی فتنے کے تقاضے پورا کر رہی ہے۔

دجالی فتنے کا پہلا وار عوامی حاکمیت کا تصور تھا جبکہ دوسرا وار سودی بینکنگ کے ذریعے نوع انسانی کا خون نچوڑ کر انہیں یہودیوں کا غلام بنانا تھا۔ اس فتنے کا آخری وار عورت کو گھر سے نکال کر چوراہے میں لے آنا ہے تاکہ خاندانی نظام تباہ و برباد ہو جائے اور انسانوں کو شرف انسانیت سے محروم کر کے انہیں محض اپنا غلام بنانے کی یہودی سازش کامیاب ہو سکے۔ موجودہ حکومت سوشل انجینئرنگ کے اس یہودی پروگرام پر پوری طرح عمل پیرا ہے۔ بلدیاتی انتخابات میں خواتین کی ۳۰ فیصد نمائندگی اور شاہین عتیق الرحمٰن کا خواتین کو پردہ ترک کر کے مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کی نصیحت اسی پالیسی کی آئینہ دار ہے۔ اسی

طرح موجودہ حکومت نے غیرملکی آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے جہادی کلچر کے خلاف بھی جہاد شروع کر دیا ہے۔ لہذا ان حالات میں موجودہ حکومت سے خیر کی کوئی توقع نہیں رہی۔

کشمیر میں ہندو بھیڑیا ہماری ماؤں بہنوں کو وحشت و بربریت کا نشانہ بنا رہا ہے۔ ہمارے پڑوس افغانستان میں اقوام متحدہ کی ظالمانہ پابندیوں کے باعث لوگ سخت فاقے سے مر رہے ہیں۔ خود پاکستان نہ صرف یہ کہ معاشی طور پر دیوالیہ ہو چکا ہے بلکہ یہاں شدید قسم کی خشک سالی کے مہیب سائے مسلط ہیں۔ ان حالات میں جشن بہاراں منانا انتہائی بے غیرتی ہے۔ میں پاکستانی مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس جشن کی تقریبات میں شریک نہ ہوں اور اپنے بچوں کو بھی اس سے منع کریں۔

ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ مغرب کی افغانستان سے دشمنی کی وجہ صرف اسلام ہے۔ تاہم معروف ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر سلطان بشیرالدین کے اس خیال کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی نظر افغانستان میں موجود تیل، گیس اور لوہے کے معدنی خزانوں پر ہے۔ بہرکیف ہمیں اپنے افغان بھائیوں کی ہرممکن مدد کرنی چاہئے اور اپنے گھر میں موجود ہر ضرورت سے زائد شے مثلاً کپڑے، اجناس اور دوائیاں وغیرہ وہاں بھجوا دینی چاہئیں۔ اسی طرح نقد رقوم سے ان کی مدد کے علاوہ اس سال ایک سے زائد قربانی کرنے والے خاندانوں کو اپنی اضافی قربانی وہیں کرنی چاہئے۔

2 فروری کا خطاب جمعہ

اگر ہماری دینی جماعتیں پاور پالیٹکس کی کشاکش میں الجھنے کے بجائے متحد و متفق ہو کر نفاذ اسلام کا مطالبہ لے کر کھڑی ہو جائیں تو یہاں بہت کم عرصے میں نفاذِ شریعت کا مرحلہ طے ہو سکتا ہے۔ فرنٹیر پوسٹ میں گستاخانہ خط کی اشاعت انتہائی غلیظ اور قابل مذمت حرکت ہے جس پر مسلمانوں کا مشتعل ہو جانا یقیناً قابل فہم ہے۔ تاہم پشاور میں ہونے والی حالیہ ہنگامی آرائی اور توڑ پھوڑ کی تائید و توثیق نہیں کی جا سکتی۔ البتہ ان واقعات سے یہ

ظاہر ہو گیا ہے کہ پاکستانی عوام میں ابھی دینی غیرت و حمیت موجود ہے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ عقائد و شعائر اسلامی کے لئے پاکستانی عوام میں جس درجے دینی حمیت و حساسیت موجود ہے اگر یہی حساسیت اسلام کے عملی نفاذ کے معاملے میں بھی پیدا ہو جائے تو پاکستان میں نفاذ اسلام کی منزل بہت جلد سر ہو سکتی ہے۔ یوں بھی انفرادی نجات کے لئے ضروری ہے کہ باطل نظام کو بدلنے کے لئے جدوجہد کی جائے۔ حضرت عمرؓ کا فرمان ہے کہ جماعت کے بغیر کوئی اسلام نہیں۔ لہٰذا اگر دین کا نظام قائم نہ ہو تو ہر مسلمان پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ کسی جماعت میں شامل ہو کر اس کے قیام کے لئے جہاد کرے۔

کراچی میں پانچ علمائے کرام کی شہادت کا واقعہ نہایت افسوس ناک ہے۔ انہی علمائے حق کی مساعی کی بدولت آج تک سیکولرزم باطل کو پاکستان میں رنگ جمانے کا پورا موقع نہیں ملا۔ اگر ہمارے علمائے کرام ہر دور میں اٹھنے والے فتنوں کے خلاف بند نہ باندھتے تو آج پاکستان بھی ترکی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دین سے ناتا توڑ چکا ہوتا۔

طالبان کی بت شکنی ـــــ امیر تنظیم اسلامی کا موقف

طالبان کی طرف سے بدھ کے تاریخی مجسموں سمیت تمام بتوں کو مسمار کرنے کے حکم کے حوالے سے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ طالبان کا یہ عمل اسلام کے مطابق ہے کیونکہ انہوں نے یہ عمل سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں اختیار کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ اپنے ہاتھ سے کسی زندہ مخلوق کی تصویر بنانے یا اس کا بت بنانے سے منع فرمایا ہے بلکہ فتح مکہ یعنی سرزمین عرب پر غلبۂ اسلام کے بعد آپؐ نے بتوں کے وجود کو ایک لحظہ گوارا نہیں کیا۔ لہٰذا مجسموں کو تباہ کرنے کا حکم دینے میں طالبان حق بجانب ہیں۔ تاہم اگر افغانستان میں بدھ مت کے پیروکار موجود ہوتے تو طالبان کے لئے اسلامی تعلیمات کے مطابق ضروری ہوتا کہ وہ انہیں اس بات کی اجازت دیں کہ وہ اپنی مخصوص عبادت گاہوں کی حدود میں ان مجسموں کو رکھ کر ان کی پوجا کر سکیں۔ اس لیے کہ اسلامی ریاست کی حدود میں غیر مسلموں اور ان کی عبادت گاہوں کا تحفظ بلاشبہ ریاست کی ذمہ داری ہے لیکن غیر مسلموں کی عبادت گاہوں سے باہر مجسموں یا بتوں کا وجود گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا طالبان کے اس اقدام کی مذمت کرنا بلاجواز ہے۔

تحفۂ حدیث

تنظیم اسلامی کے علاقائی اجتماع برائے حلقہ پنجاب و آزاد کشمیر کے موقع پر امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ نے ۲۴ اور ۲۵ فروری کو نماز فجر کے بعد درس حدیث دیا۔ امیر محترم نے دوسرے دن کے درس کے بعد دونوں دن پیش کی جانے والی حدیثوں کو اپنی جانب سے شرکائے اجتماع کے لئے ایک تحفہ قرار دیا اور اپنی اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ حاضرین درس ان دونوں حدیثوں کا متن زبانی یاد کرلیں۔ دونوں حدیثوں کا متن اور ترجمہ اس خیال سے میثاق میں شائع کیا جارہا ہے کہ حکمت نبویؐ کے اس عظیم خزانہ سے استفادے کا دائرہ وسیع تر ہو سکے اور رفقاء تنظیم اسلامی انہیں زبانی یاد کرکے حرزِ جان بناسکیں۔ (خالد محمود خضر)

۱

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ انَّ رسولَ اللہ ﷺ قال :

((ثَلاَثٌ مُنْجِیَاتٌ وَ ثَلاَثٌ مُهْلِكَاتٌ ' فَاَمَّا الْمُنْجِیَاتُ فَتَقْوَی اللّٰهِ فِي السِّرِّ وَالْعَلاَنِیَةِ ' وَالْقَوْلُ بِالْحَقِّ فِي الرِّضٰی وَالسَّخَطِ ' وَالْقَصْدُ فِي الْغِنٰی وَالْفَقْرِ ' وَاَمَّا الْمُهْلِكَاتُ فَهَوًی مُتَّبَعٌ ' وَشُحٌّ مُطَاعٌ ' وَاِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ ' وَهِيَ اَشَدُّهُنَّ))

رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

"تین چیزیں نجات دینے والی ہیں اور تین ہلاک کر دینے والی ہیں۔ نجات دینے والی چیزیں یہ ہیں : (۱) پوشیدہ اور ظاہر ہر حال میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنا۔ (۲) خوشی اور ناخوشی میں حق بات کہنا۔ (۳) مال داری اور فقیری میں میانہ روی اختیار کرنا ـــــ جبکہ ہلاک کرنے والی چیزیں یہ ہیں : (۱) وہ خواہش نفس جس کی پیروی کی جائے۔ (۲) ایسی حرص جس کی فرمانبرداری کی جائے۔ (۳) آدمی کا خود اپنے بارے میں گھمنڈ میں مبتلا ہو جانا' اور یہ آخری بات سب

سے شدید ہے"۔ (اس حدیث کو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ بحوالہ مشکوٰۃ' کتاب الاداب' باب الغضب والکبر)

۲

عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ اَنَّ رسولَ اللّٰہ ﷺ قال :

((اَمَرَنِیْ رَبِّیْ بِتِسْعٍ : خَشْیَۃِ اللّٰہِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَۃِ ' وَکَلِمَۃِ الْعَدْلِ فِی الْغَضَبِ وَالرِّضٰی ' وَالْقَصْدِ فِی الْفَقْرِ وَالْغِنٰی ' وَاَنْ اَصِلَ مَنْ قَطَعَنِیْ ' وَاُعْطِیَ مَنْ حَرَمَنِیْ ' وَاَعْفُوَ عَمَّنْ ظَلَمَنِیْ ' وَاَنْ یَکُوْنَ صَمْتِی فِکْرًا ' وَنُطْقِیْ ذِکْرًا ' وَنَظَرِیْ عِبْرَۃً ' وَآمُرَ بِالْعُرْفِ ' وَقِیْلَ : بِالْمَعْرُوْفِ)) رواہ رزین

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

"میرے رب نے مجھے نو(۹) باتوں کا حکم دیا ہے :

(۱) چھپے اور کھلے ہر حال میں اللہ سے ڈرتا رہوں۔

(۲) ناراضی اور خوشی ہر کیفیت میں انصاف کی بات کروں۔

(۳) تنگ دستی اور تونگری ہر حالت میں میانہ روی اختیار کروں۔

(۴) جو مجھ سے کٹے مَیں اس سے جڑوں۔

(۵) جو مجھے محروم رکھے میں اسے عطا کروں۔

(۶) جو مجھ پر ظلم کرے اسے میں معاف کردوں۔

(واضح رہے کہ یہ دعوت کا مرحلہ ہے)

(۷) میری خاموشی غور و فکر کے لئے ہو۔

(۸) میرا بولنا ذکر کے لئے ہو (یعنی اللہ کا ذکر اور لوگوں کے لئے تذکیر و نصیحت)

(۹) میرا دیکھنا عبرت کا دیکھنا ہو۔

اور (ان سب کے علاوہ) یہ کہ

میں امر بالمعروف (و نہی عن المنکر) پر کاربند رہوں"۔

(اسے امام رزین رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ بحوالہ جامع الاصول ۱۱/ ۶۸۷)

تذکرہ وتبصرہ

ڈاکٹر اسرار احمد

جمہوریت' اسلام اور پاکستان

"نوائے وقت" کی ۳۰ / جنوری کی اشاعت میں ایک ادارتی شذرہ میں امیر تنظیم اسلامی' ڈاکٹر اسرار احمد کے ایک خطاب عام کی اخباری رپورٹنگ کے حوالے سے جمہوریت اور انتخابات سے متعلق امیر تنظیم کے موقف کو کسی قدر تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا ـــــ محترم ڈاکٹر صاحب نے اس پر اپنی جوابی وضاحت مسجد دار السلام باغ جناح کے ۹/ فروری کے خطاب جمعہ میں پیش کی اور اپنے موقف کو پورے سیاق و سباق کے ساتھ سامعین کے سامنے رکھا ـــــ محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ پورا خطاب ذیل میں ہدیہ قارئین کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

حمد و ثنا' درود و سلام' خطبہ مسنونہ' اور تلاوتِ آیات کے بعد فرمایا :

یہ میرا ایک بہت پرانا اور مستقل موقف ہے جسے میں گزشتہ پچیس تیس برس سے مسلسل بیان کر رہا ہوں' کہ پاکستان میں اسلام کا نفاذ انتخابی عمل کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔ انتخابات میں حصہ لے کر اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس ذریعے سے پاکستان میں اسلامی نظام قائم کیا جا سکتا ہے یا اسلامی قوانین کی کامل ترویج و تنفیذ ممکن ہے تو مجھے اس سے اختلاف ہے۔ پاکستان میں اسلام کے نفاذ کے لئے لازم ہے کہ دینی جماعتیں پاور پالیٹکس سے پسپائی اختیار کریں' انتخابی میدان سے واپسی کا راستہ اختیار کریں اور نفاذ اسلام کے لئے ایک پریشر گروپ کی صورت میں پُرامن احتجاجی اور مطالباتی تحریک چلائیں' جس کا معاملہ بالآخر غیر مسلح بغاوت تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کا صرف یہی ایک راستہ ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا یہ بات میں پچیس تیس برس سے کہہ رہا ہوں۔ ۱۹۵۴ء میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد میں منٹگمری (ساہیوال) چلا گیا تھا۔ لاہور سے گیارہ برس باہر رہنے کے بعد انفرادی سطح پر دین کی ایک تحریک کا آغاز

کرنے کے لئے ۱۹۶۵ء میں لاہور واپس آیا۔ اُس وقت سے اب تک مسلسل ۳۵ برس ہو چکے ہیں کہ میں اپنے اس موقف پر جازم ہوں' بلکہ اپنے اسی موقف کی بناء پر میں ۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوا تھا۔ اس لئے کہ مولانا مودودیؒ نے ۱۹۵۱ء میں ایک نیا راستہ اختیار کر لیا تھا کہ انتخابات میں حصّہ لے کر کوشش کی جائے کہ اس ذریعے سے پاکستان میں اسلام نافذ کر دیا جائے۔ میں نے ۵۷ء میں کہا کہ کم از کم چھ سال کا تجربہ ہمیں یہ بتا چکا ہے کہ اس راستے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا اور میں اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ یہ بالکل بے کار اور بے نتیجہ عمل (exercise in futility) ہے۔ لیکن مولانا مودودی اُس وقت تک اپنے موقف پر جازم تھے اور انہیں اُس وقت تک امید تھی کہ الیکشن کے راستے سے نظام کی تبدیلی ممکن ہے۔ ان کی یہ امید ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے بعد منقطع ہوئی۔ لیکن اس وقت یوں سمجھئے کہ بہت دیر ہو چکی تھی' وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ چکا تھا' خود مولانا بوڑھے ہو چکے تھے اور اب از سرِ نو ایک موڑ دے کر تحریک کو دوبارہ ایک نئے رخ پر اُستوار کرنا ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔ بہرحال میری جماعت سے علیحدگی اسی بناء پر ہوئی تھی۔ گویا کہ ۱۹۵۷ء سے میرا یہ موقف بالکل واضح ہے اور ۱۹۶۵ء سے میں اسے مسلسل بیان کر رہا ہوں۔

۲۸ جنوری کو تحریک خلافت پاکستان کے زیر اہتمام انٹرنیشنل خلافت کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں بھی مَیں نے یہی بات دہرائی۔ اس کا بڑا چرچا ہوا' اس لئے کہ پریس میں بھی اچھی کوریج ہوئی تھی۔ یہ کانفرنس "ایوان اقبال" میں منعقد ہوئی تھی جو لاہور کا سب سے بڑا اور وسیع ترین ہال ہے اور اس روز یہ بڑا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور محض محاورتاً ہی نہیں بلکہ حقیقتاً وہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ چونکہ یہ بات اس کانفرنس میں لوگوں کے سامنے آئی تو وہ ذرا زیادہ نمایاں ہو گئی۔ چنانچہ نوائے وقت کے اداریہ نگار یا شذرہ نگار نے مجھ سے اختلاف کرتے ہوئے ۳۰ جنوری کے اخبار میں ایک اداراتی شذرہ لکھا۔ اس وقت مَیں اسی کے ضمن میں کچھ وضاحتیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

جمہوریت اور اسلام کا باہمی تعلق؟

جس طرح آج کا عنوان تین الفاظ جمہوریت' اسلام اور پاکستان سے مل کر بنا ہے

ایسے ہی اس مسئلے کے تین اَبعاد (Dimensions) ہیں۔ اولاً یہ کہ اصولی اور نظریاتی اعتبار سے جمہوریت اور اسلام کا کیا رشتہ ہے؟ اس ضمن میں اوّلین بات یہ ہے کہ دنیا میں جو معروف جمہوریت، یعنی مغربی اور سیکولر جمہوریت اس وقت رائج ہے وہ اسلام کے نزدیک کفر اور بدترین شرک ہے۔ اس لئے کہ اس کا اصول عوام کی حاکمیت (Sovereignty of the people) ہے، اور اسلام اور قرآن کی رو سے حاکمیت عوام کی ہو یا کسی فردِ واحد کی، دونوں برابر کا کفر اور شرک ہیں، کیونکہ حاکمیت صرف اللہ کی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے : ﴿ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ﴾ اس اعتبار سے پوری دُنیا میں جو مروّجہ تصورِ جمہوریت ہے وہ اسلام کے ساتھ compatible نہیں ہے۔ اس لئے کہ معاملہ جڑ بنیاد ہی سے مختلف ہے۔ اسلام تو نظام کو حاکمیتِ الٰہی (Divine Sovereignty) پر قائم کرتا ہے جبکہ جمہوریت میں حاکمیتِ انسانی (Human Sovereignty) کا تصور ہے۔

انسانی حاکمیت کی ایک صورت تو ملوکیت (monarchy) کی ہے کہ ایک شخص بادشاہ بن کر بیٹھا ہوا ہو اور اسی کے ہاتھ میں سارے اختیارات ہوں۔ اور ایک صورت عوامی حاکمیت (Sovereignty of the people) کی ہے۔ اصولی اعتبار سے دونوں بدترین کفر اور بدترین شرک ہیں۔ البتہ اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرنے کے بعد اس کے نیچے نیچے، اور اس کے تابع رہتے ہوئے مسلمانوں کے باہمی مشورے سے جو نظام بنے گا اسے آپ "اسلامی جمہوریت" کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ جمہوریت قرآن کی اصطلاح نہیں ہے لیکن ذہنوں تک بات کو پہنچانے کے لئے ہمیں جدید اصطلاحات اختیار کرنا پڑتی ہیں۔ ہم تو اسے شورائیت کہیں گے، لیکن جمہوریت کا لفظ بھی درحقیقت اسی معنی میں بجا طور پر مستعمل ہو جائے گا۔

اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرنے کے معانی یہ ہوں گے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی بلا استثناء بالادستی تسلیم کی جائے۔ اب اگر کتاب و سنت کی بلا استثناء بالادستی تسلیم کر لی جائے تو اس کے نیچے نیچے جو معاملہ رہ جاتا ہے اس کی حد تک جمہوریت اسلام سے پورے طور پر مطابقت رکھتی ہے، بلکہ میں اس سے اگلی بات کروں گا کہ یہ عین اسلام ہے۔ گویا کہ یہ ایک طرح کی "محدود جمہوریت" (limited democracy) ہے۔

اس کی حدود (limitations) کیا ہیں؟ سب سے پہلے نمبر پر اللہ کی حاکمیت۔ آپ اللہ کے قانون کو نہیں بدل سکتے' سو فیصد لوگ بھی نہیں بدل سکتے۔ اس کے اوامر و نواہی (dos and donts) جوں کے توں قائم رہیں گے۔ البتہ جہاں اللہ کا کوئی حکم نہیں ہے' وہاں ہو سکتا ہے کہ رسول ﷺ نے کوئی حکم دے دیا ہو۔ چنانچہ اگر صحیح حدیث موجود ہو جو مسلمہ اور مستند ہو تو وہ بھی واجب التنفیذ اور واجب التعمیل ہے۔ اب اگر حدیث اور سنتِ رسول ﷺ میں بھی کوئی واضح ہدایت نہ ہو تو ہم اس کو اب "اَمْرُهُمْ" کہیں گے' یعنی اللہ نے یہ معاملہ لوگوں پر چھوڑ دیا ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے انتظامی معاملات کے ضمن میں اللہ اور رسول ﷺ کے احکام صرف گنتی کے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ انسانوں پر چھوڑ دیا ہے اور اس کے ضمن میں الفاظِ قرآنی ﴿ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ میں واضح رہنمائی موجود ہے کہ جملہ معاملات تمہارے باہمی مشورے سے طے ہوں گے۔ گویا یہ نہیں کہ ان "مباحات" کے معاملے میں بھی تم میں سے کوئی ایک شخص کہے کہ میرا اختیار چلے گا' میں جو چاہوں گا طے کروں گا۔ نہیں' بلکہ یہ "اَمْرُهُمْ" باہمی مشاورت سے طے ہو گا۔

یہ بات ایک قرآنی آیت اور ایک حدیثِ نبویؐ کی روشنی میں سمجھ لیجئے۔ سورۃ الحجرات کی پہلی آیت ہے :

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾ (الحجرات: ۱)

یعنی "اے اہل ایمان! اللہ اور اس رسولؐ سے آگے مت بڑھو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' بیشک اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے"۔

گویا اللہ اور رسولؐ سے آگے بڑھو گے تو کفر ہو جائے گا۔ ان دونوں کے احکام کے پیچھے پیچھے رہو۔ اس کی وضاحت اس حدیث سے ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَمَثَلِ الْفَرَسِ فِي اَخِيَّتِهٖ)) (مسند احمد)

"مومن کی مثال تو اس گھوڑے کی سی ہے جو اپنے کھونٹے سے بندھا رہتا ہے"۔

یہ بڑی بنیادی بات ہے۔ جو شخص اللہ اور رسولؐ کو نہیں مانتا وہ ایک بے لگام گھوڑے کی

مانند ہے' لہٰذا جدھر چاہے جائے اور جو چاہے کرے' وہ مادر پدر آزاد ہے۔ لیکن جو اللہ کو مان لے گا وہ اللہ کے احکام کا پابند ہو گیا۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مؤمن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند!

رسول ؐ کو مان لیا تو رسول ؐ کے احکام کا پابند ہو گیا' قرآن کو مان لیا تو قرآن کے احکام کا پابند ہو گیا۔ تو اس کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے' وہ اپنی مرضی سے بھاگ دوڑ نہیں سکتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اس گھوڑے کو ذرا لمبی رسّی سے باندھ دیں۔ اگر آپ کے پاس کھلا میدان موجود ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ گھوڑے کے ہاتھ پاؤں کھلے رہیں' وہ چلے پھرے' دوڑے بھاگے' کھڑا کھڑا شل نہ ہو جائے' تو فرض کیجئے کہ ایک وسیع میدان میں آپ نے اسے دو سو گز لمبی رسّی سے باندھ دیا۔ اس طرح اس کے کھونٹے کے گرد ایک دو سو گز نصف قطر (radius) کا دائرہ وجود میں آ جائے گا۔ اس دائرے میں یہ گھوڑا آزاد ہے کہ وہ شمال میں جائے یا جنوب میں' مشرق میں جائے یا مغرب میں' سو گز پر جائے' ڈیڑھ سو گز پر جائے' پونے دو سو گز پر جائے یا پورے دو سو گز پر چلا جائے' لیکن کسی سمت میں بھی اُسے دو سو ایک واں گز نہیں آئے گا۔ یہ پورا دائرہ اس کی آزادی (freedom) کا ہے' لیکن وہ آزادی کے اس دائرہ سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ بقول علامہ اقبال ؎

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے' پا بہ گِل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تُو کر لے!

اس حدیث کے حوالے سے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ سورۃ الحجرات میں جو فرمایا گیا کہ : ﴿ لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ "اللہ اور اس کے رسول ؐ سے آگے نہ بڑھو!" تو یہ اللہ اور اس کے رسول ؐ کے احکام کا دائرہ ہے' جسے کراس نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس دائرے کے اندر اللہ نے تمہارے جملہ معاملات تمہارے حوالے کر دیئے ہیں۔ لیکن ان کے ضمن میں بھی بفحوائے الفاظِ قرآنی ﴿ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ طے کر دیا ہے کہ اس میں بھی کسی فرد واحد کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ خود مختارانہ

(authoritative) انداز اختیار کرلے' اس لئے کہ اس دائرے کے اندر جو کچھ ہے وہ مباح ہے اور مباحات میں بھی فیصلہ باہمی مشاورت سے ہو گا۔ صرف خالص انفرادی معاملات میں آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً اپنے گھر میں آپ نے کوئی استقبالیہ (reception) طے کیا ہے' کوئی دعوت منعقد کی ہے تو اس میں کیا مشروب پیش کیا جائے ؟ یہ بات تو طے ہو گئی کہ اس میں شراب نہیں پیش کی جا سکتی کیونکہ وہ تو حرام ہے' لہٰذا وہ تو اللہ اور اس کے رسولؐ کے دائرے سے باہر ہو گئی۔ باقی یہ کہ آپ وہاں روح افزا پلائیں' سبز چائے یا کشمیری چائے پیش کریں' یا سیون اپ وغیرہ دیں' یہ سب مباحات میں سے ہیں۔ ان مباحات میں گھر کا سربراہ بھی فیصلہ کر سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا کہ گھر کے سب افراد کی رائے لے کر جو اکثریت کی رائے ہو اس کے مطابق طے کر دیا جائے۔ اکثریت کی رائے حرام کو حلال نہیں کرے گی اور حلال کو حرام نہیں کرے گی' البتہ وہ مباحات ہی میں سے طے کر سکتی ہے کہ کیا چیز اختیار کی جائے اور کیا اختیار نہ کی جائے۔

اس اعتبار سے یہ عین جمہوریت ہے' اور اسلام کی روح کے مطابق ہے۔ اس لئے کہ درحقیقت اس تصور کو سب سے پہلے دنیا کی تاریخ میں نظریاتی سطح پر رسول اللہ ﷺ نے متعارف کروایا ہے۔ اگرچہ تاریخ عالم کے دوران میں ہمیں یونان اور روم کی شہری ریاستوں میں جمہوریت کے کچھ آثار نظر آتے ہیں' مختلف معاملات میں مشاورت ہوتی تھی' لیکن اسے پورے نظام کی شکل میں تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ محمد رسول اللہ ﷺ نے متعارف کروایا ہے۔

اس کے ساتھ ہی خلافت راشدہ کے دوران ہی یہ صراحت بھی کر دی گئی کہ خلافت کے تحت جو سیاسی نظام بنے گا وہ "اَمْرُ الْمُسْلِمِیْنَ" ہو گا۔ یہ لفظ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے استعمال کیا' جبکہ ان کے دور خلافت کا آخری سال تھا اور آپ حج پر تھے۔ وہاں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ امیرالمؤمنین! میں ایک تشویشناک بات سن رہا ہوں' بہت سے لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ جیسے ہی عمرؓ کی آنکھ بند ہو گی ہم فوراً فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے۔ یعنی مسلمانوں کو مشورے کا موقع ہی نہیں دیں گے۔ حضرت عمرؓ نے جب یہ سنا تو آپ کو بھی بہت تشویش ہوئی۔ یہ بخاری' مسلم اور مسند احمد بن حنبل میں وارد شدہ بڑی طویل حدیث ہے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ

نے فرمایا : "اچھا یہ بات ہے' فوراً لوگوں سے کہو کہ وہ جمع ہو جائیں' میں چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ لوگوں کے سامنے واضح کر دوں۔ (فَمُحَذِّرُهُمْ هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَغْصِبُوْا اَمْرَ الْمُسْلِمِيْنَ) یعنی "تاکہ میں سازشی لوگوں کی سازش کا پردہ چاک کر دوں اور لوگوں کو ان کی سازش کے خلاف خبردار کر دوں کہ وہ مسلمانوں کے معاملے کو غصب کرنا چاہتے ہیں"۔

گویا باہمی مشورے سے خلافت کا فیصلہ کرنا مسلمانوں کا حق ہے۔ اور جو لوگ انہیں مشورے کا موقع دیئے بغیر اچانک کسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ ان کا حق غصب کرنے کی سکیم بنا رہے ہیں۔ یہ تو ایسی بات ہے جس پر بغیر کسی تاخیر کے فوراً مسلمانوں کو متنبہ کر دیا جانا چاہئے۔ اس پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے عرض کیا : "اے امیرالمؤمنین! یہ موسم حج ہے' یہاں ہر طرح کا آدمی آیا ہوا ہے' اگر یہ ایشو آپ نے یہاں چھیڑا تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ہنگامہ ہو جائے اور بھانت بھانت کی بولیاں یہاں شروع ہو جائیں' لہٰذا یہاں اس کو نہ چھیڑیئے' آپ مدینے واپس جا کر اس ایشو کو طے کر لیجئے"۔ حضرت عمرؓ نے یہ مشورہ مان لیا۔ لیکن مدینے جا کر آپؓ نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا کہ یہ مسلمانوں کا اجتماعی معاملہ ہے' اسے چند لوگ بیٹھ کر طے نہیں کر سکتے' اور یہاں تک فرمایا کہ "مَنْ بَايَعَ اَمِيْرًا بِغَيْرِ مَشْوَرَةِ الْمُسْلِمِيْنَ فَلَا بَيْعَةَ لَهٗ" یعنی "اگر کسی نے مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی امیر کے ہاتھ پر بیعت کی تو وہ کوئی بیعت نہیں ہوگی" یعنی وہ بیعت کالعدم ہوگی null and void ہوگی۔

یہ اسلام کا بنیادی سیاسی نظام ہے اور اس کے اندر اس قدر جمہوریت جزو لاینفک کے طور پر شامل ہے۔ البتہ اسلام میں وہ مادر پدر آزاد جمہوریت نہیں ہے کہ حاکمیت انسان کی ہو جائے۔ حاکم حقیقی تو اللہ ہے' اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام بالاتر ہیں لیکن اس کے نیچے جو دائرہ ہے اس میں جمہوریت یا شورائیت ہے' جس میں مشوروں سے معاملہ طے ہوگا اور کوئی حرج نہیں کہ اکثریت سے معاملہ طے ہو جائے۔ یہ ہے وہ بات جو میں جمہوریت کے بارے میں ہمیشہ عرض کرتا رہا ہوں۔ نوائے وقت کے شذرہ نگار نے کہا

ہے کہ میں نے جمہوریت اور اسلام کو ایک دوسرے کے نقیض قرار دے دیا ہے' معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ میں تو کہہ رہا ہوں کہ اس محدود معنی میں جمہوریت عین اسلام ہے' بلکہ تاریخ انسانی میں سب سے پہلے بڑے پیمانے پر جمہوریت کو روشناس کرانے والے محمدؐ عربی ﷺ ہی تھے۔

اسلام میں انسانوں کے مابین صرف ایک تفریق جائز ہے اور وہ تفریق نظریئے کی بنیاد پر ہے۔ جو کوئی اللہ کو مانتا ہے' محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو مانتا ہے' قرآن کو مانتا ہے' بعث بعد الموت اور جنت و دوزخ کو مانتا ہے' وہ دائرۂ اسلام کے اندر ہے اور جو نہیں مانتا وہ اس دائرے سے باہر ہے۔ اسلام کے سیاسی و معاشرتی نظام میں صرف یہ تفریق لائق اعتبار ہے' باقی کوئی تفریق انسانوں کے درمیان معتبر نہیں ہے' کوئی چھوٹا نہیں' کوئی بڑا نہیں' کوئی گھٹیا نہیں' کوئی بڑھیا نہیں' کوئی اعلیٰ نہیں' کوئی ادنیٰ نہیں' کوئی برہمن نہیں' کوئی شودر نہیں۔ تمام انسان پیدائشی طور پر (by birth) برابر ہیں۔ گویا دستوری اور قانونی سطح پر اسلام کامل انسانی مساوات کا علمبردار ہے۔ ہاں صرف مسلم اور غیر مسلم کا فرق ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اسلام ایک نظریاتی ریاست بنانا چاہتا ہے اور اس میں نظریہ فیصلہ کن شے ہے' کیونکہ اس کی اصل بنیاد ہی نظریہ پر قائم ہے' یعنی اللہ' رسول' قرآن اور آخرت پر ایمان اصل بنیاد ہے' جو اس کو نہیں مانتے ان کا معاملہ علیحدہ ہو گا۔ اس لئے اس کو "اَمْرُ الْمُسْلِمِیْنَ" بھی کہا گیا ہے۔ گویا خلافت اور ریاست مسلمانوں کا اجتماعی معاملہ ہے۔ یہاں سب مسلمان برابر ہو جائیں گے۔ امام اعظم امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "اَلْمُسْلِمُ کُفُوٌ لِکُلِّ مُسْلِمٍ" اس میں کوئی شک نہیں کہ دستوری اور قانونی معاملات میں امام ابو حنیفہؒ تمام ائمہ فقہاء میں سرفہرست ہیں اور آپ کو قانون اور دستور کا جس قدر گہرا فہم (Sense) تھا وہ دوسروں کے ہاں نہیں ہے۔ اسلامی فقہ یعنی دستور اور قانون کی عظیم ترین اتھارٹی امام ابو حنیفہؒ ہیں۔ ان کے قول کے مطابق اب یہاں سب مسلمان آپس میں برابر ہو جائیں گے۔ اس کی بنیاد پر آج کل "One man one vote" کا معاملہ بھی چل سکتا ہے۔ یہ نہیں ہو گا کہ ایک شخص فاسق ہے تو اسے ووٹ کا حق نہیں دیا جائے گا اور دوسرا نیک ہے تو اس کے ہاتھ میں ووٹ کی پرچی تھما دی جائے گی۔ یہ نہیں ہو گا کہ مسجدوں میں حاضری رجسٹر کھول دیئے جائیں' ہر شخص وہاں حاضری لگوائے اور پھر

دیکھیں کہ پورے سال میں اس کی کس قدر حاضری ہے۔ بلکہ فاسق و فاجر ہو یا متقی اور صالح ہو' جب تک کوئی مسلمان ہے اس کا حق رائے دہی موجود ہے۔ جیسا کہ ایک باپ کے اگر دو بیٹے ہیں' اک انتہائی متقی و پرہیز گار ہے' تہجد گزار ہے اور دوسرا فاسق و فاجر ہے' جو پنج وقتہ نماز بھی پابندی سے نہیں پڑھتا' لیکن باپ کی وفات کے بعد وراثت دونوں کو برابر ملے گی۔ یہ نہیں ہو گا کہ متقی اور تہجد گزار کو تین چوتھائی دے دیا جائے اور دوسرے کے حصے ایک چوتھائی آئے۔ قانونی اور دستوری سطح پر اصول یہی ہو گا کہ "اَلْمُسْلِمُ کُفْوٌ لِکُلِّ مُسْلِمٍ" "تمام مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ مساوی ہیں"۔ اس بناء پر جمہوریت کا بہترین نظام جہاں تک دنیا پہنچی ہے وہ اسلام میں compatible ہے۔

البتہ یہ دوسری بات ہے کہ کس شخص کو نامزد کیا جائے' کس شخص کو ووٹ دیا جائے۔ اس کے ضمن میں قرآن کے اس حکم کو پیش نظر رکھا جائے گا :

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ﴾ (النساء : ۵۸)

یعنی "(مسلمانو!) اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل لوگوں کے سپرد کرو!"۔

اور یہ رائے (ووٹ) تمہارے پاس بہت بڑی امانت ہے' اسے اس کے اہل کے حوالے کرو۔ اس کے لئے دیکھو' واقعی کوئی اللہ کا متقی بندہ ہے یا نہیں؟ اگر وہ اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو کیا وہ ہم سے دھوکے بازی نہیں کرے گا؟ وہ لوٹ کھسوٹ سے کس طرح باز رہے گا؟ جو اللہ سے دھوکے بازی کر رہا ہو اس سے کیسے آپ توقع کریں گے کہ وہ ہمارے ساتھ دیانت برتے گا؟ ووٹ دیتے ہوئے دیکھنا ہو گا کہ میں کس کو ووٹ دے رہا ہوں۔ گویا اسلامی ریاست میں ووٹ دینے کا حق ہر مسلمان کو حاصل ہے' اِلّا یہ کہ کسی شخص کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ یہ غیر مسلم ہے' کسی شخص کے بارے میں پتہ چل جائے کہ یہ قادیانی ہے تو اس کا ووٹ ختم ہو جائے گا' کسی کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہ تو ہندو ہے اور یہاں دہشت گردی کے لئے آیا تھا تو اس کا ووٹ ختم ہو جائے گا۔ جب تک آپ اسے مسلمان مانیں گے اس کا ووٹ برقرار رہے گا۔ بہرحال اس اعتبار سے میرے نزدیک محدود معانی میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی بالادستی کے دائرے کے اندر اندر یہ جمہوریت عین اسلام ہے۔ میں

اس بات کی تردید کرتا ہوں کہ میں نے معاذ اللہ جمہوریت کو اسلام کے نقیض قرار دیا۔

رہی یہ بات کہ نوائے وقت کے شذرہ نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ "حالانکہ ڈاکٹر صاحب علامہ اقبال کے بڑے شیدائی ہیں" تو اس میں کوئی شک نہیں کہ میں علامہ اقبال کا شیدائی ہوں۔ مجھ پر تو بہت سے لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ اپنی تقاریر اور دروس میں اقبال کے اتنے حوالے کیوں دیتے ہیں اور اس کے اتنے شعر کیوں پڑھتے ہیں' وہ کوئی دیندار مسلمان تو نہیں تھے' انہوں نے تو آخری دن بھی شیو کیا تھا' وغیرہ وغیرہ۔ پنجاب کی فضا کچھ اور ہے لیکن کراچی جا کر دیکھیں تو آپ کو یہ اعتراضات ملیں گے۔ اندرون سندھ چلے جائیں تو اور زیادہ تلخ سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان کے بارے میں بہت سی بے بنیاد باتیں لوگوں میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن میں واقعتاً ان کا شیدائی ہوں۔ اس لئے کہ انہوں نے کتاب و سنت کی بنیادی تعلیمات کی جو تعبیرات کی ہیں وہ واقعتاً اس قابل ہیں کہ انہیں ہم سینوں سے لگائیں' حرز جان بنائیں اور اسلام کی تعلیمات کے افہام و تفہیم کا ذریعہ بنائیں۔

اسلامی ریاست کے بارے میں علامہ اقبال نے جو دو باتیں کہی ہیں میں ان کا پوری طرح قائل ہوں۔ ایک یہ کہ انہوں نے اسے جمہوری طرز حکومت (Republican form of government) سے بہت قریب قرار دیا ہے۔ یہ بات اسلام کے مزاج کے ساتھ عین مطابقت رکھتی ہے اور میں صد فیصد اس کا قائل ہوں۔ دوسری بات بہت اہم کہی کہ اس دور میں اجتہاد پارلیمنٹ کرے گی۔ میں اس کا بھی قائل ہوں' اگرچہ اس کا جو مفہوم ان کے پسر ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب لیتے ہیں اس سے مجھے اختلاف ہے' وہ میں بعد میں عرض کروں گا' لیکن اقبال کے اس قول سے مجھے مکمل اتفاق ہے کہ آج اجتہاد پارلیمنٹ کرے گی۔ اس اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ علامہ اقبال نے جو کچھ بھی کہا یقیناً صحیح کہا۔ میں ان دونوں معاملات میں ان کی رائے کا پوری طرح قائل ہوں۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ حضرتِ علامہ کے ان افکار کی مزید وضاحت اور تشریح مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے کی اور میں نے ان سے بھی استفادہ کیا ہے۔ بلکہ میں اس مقام پر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ واقعتاً ایک Political Scientist of Islam ہونے کے اعتبار سے مولانا مودودی

بیسویں صدی عیسوی کی سب سے عظیم شخصیت ہیں۔ اگرچہ جہاں تک عملی سیاست میں ان کے رول کا تعلق ہے وہ ایک بالکل مختلف چیز ہے' وہ اس میدان کے آدمی ہی نہیں تھے' وہ تو تالیف و تصنیف کے میدان کے آدمی تھے اور بڑے عظیم مصنف تھے' اور اس میدان کے آدمی کو صحیح اندازہ نہیں ہوتا کہ لوگوں کی کیا سوچ ہے' وہ تو اپنی سوچ اور اپنے خیالات میں مگن ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عملی سیاست میں تو بالکل ناکام ثابت ہوئے لیکن بیسویں صدی میں عالم اسلام کے عظیم ترین پولٹیکل سائنٹسٹ میرے نزدیک مولانا مودودی مرحوم ہی ہیں۔

اس میدان میں مولانا مودودی کی دو contributions بہت قیمتی ہیں۔ "اسلام کا نظریہ سیاسی" میں انہوں نے لکھا ہے کہ اسلامی ریاست نہ تھیوکریسی ہے' نہ ڈیموکریسی ہے' بلکہ یہ "تھیوڈیموکریسی" (Theo-Democracy) ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اقبال ہی کے فکر کی انہوں نے مزید وضاحت کی ہے اور بڑی ہی پیاری بات کی ہے۔ یہ ڈیموکریسی بھی ہے اور تھیوکریسی بھی' لیکن تھیوکریسی کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی مذہبی طبقہ حکمران بن کر بیٹھ جائے اور پوپ یا علماء کو حکومت کا اختیار دے دیا جائے۔ یہ نہیں' بلکہ تھیوکریسی کا صرف یہ حصّہ اسلام کے سیاسی نظام کا جزو ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی بالادستی رہے گی۔ باقی اس کے نیچے نیچے ڈیموکریسی ہے۔ اس کیلئے "تھیوڈیموکریسی" کی اصطلاح مولانا مودودی نے ایجاد کی تھی' لہٰذا اسلئے میں ہمیشہ اس کا تذکرہ ان کے نام سے کرتا ہوں تاکہ "حق بہ حقدار رسید!"

مولانا مودودی مرحوم نے دوسری اصطلاح "خلافتِ عامّہ" (Popular Vicegerency) کی استعمال کی ہے۔ یہ اصطلاح انہوں نے عوامی حاکمیت (Popular sovereignty) کے مقابلے میں وضع کی ہے۔ مغربی جمہوریت میں عوامی حاکمیت کا تصور ہے۔ انہوں نے کہا اسلام میں عوامی خلافت ہے یعنی حاکمیت اللہ کی' خلافت عوام کی۔ یہاں میں تھوڑا سا اختلاف کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ یہ عوامی (Popular) نہیں ہے بلکہ خلافت المسلمین (Vicegerency of the Muslims) ہے۔ یہ "امر المسلمین" ہے' اس میں کوئی غیر مسلم شامل نہیں ہوگا۔ عوامی (popular) میں تو سب شامل ہو جائیں گے اور اس کا جدید تصور تو یہی ہے کہ کوئی

چاہے ہندو ہے یا مسلمان' سکھ ہے یا عیسائی' قادیانی ہے یا پارسی سب کا ایک ایک ووٹ ہے۔ امریکہ میں جو بھی نیشنلز ہوتے ہیں چاہے وہ پاکستان سے گئے ہیں اور بعد میں انہوں نے وہاں کی شہریت حاصل کرلی ہے ان کا بھی ایک ہی ووٹ ہے اور جو دس پشتوں سے وہاں آباد ہیں ان کا بھی ایک ہی ووٹ ہے' کالے کا بھی ایک ہی ووٹ ہے اور گورے کا بھی ایک ہی ووٹ ہے۔ وہاں معاملہ یہ ہے کہ نظریاتی تقسیم نہیں ہے' جبکہ اسلامی ریاست تو ایک نظریاتی ریاست ہے لہٰذا یہاں نظریاتی تقسیم یقینی ہے۔ ایک تو یہ "خلافت" ہے' "حاکمیت" نہیں' دوسرے یہ کہ یہ "عوامی" نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کا اجتماعی معاملہ ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا' اس ضمن میں مَیں نے مولانا مودودی مرحوم کے خیالات سے بھی استفادہ کیا ہے اور حضرت علامہ اقبال کے افکار سے بھی' بلکہ اقبال کا فکر تو میری سوچ کے بڑے بنیادی sources میں سے ہے' لیکن میں نے اس میں کچھ اضافے بھی کئے ہیں اور اس حدیث کے ساتھ بھی تعلق جوڑا ہے جو پہلے بیان کی جا چکی ہے اور سورۂ حجرات کی پہلی آیت سے بھی! جہاں تک حدیث کا تعلق ہے تو اس کا اگر آپ کسی بلیک بورڈ پر نقشہ بنائیں تو بات بہت واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ اور رسول کے احکام کی حیثیت ایک دائرے کی ہے اور اس دائرے کے اندر اندر ڈیموکریسی ہے' لیکن یہ ڈیموکریسی اس دائرے سے باہر نہیں جا سکتی' یہ کسی حرام کو حلال نہیں کر سکتی' اور کسی حلال کو حرام نہیں کر سکتی۔ یہ دائرہ کتاب و سنت کے احکام (Injunctions of the Quran and the Sunnah) سے بنا ہے۔ ہمارے دستور پاکستان کی دفعہ ۲۷۷ بھی یہی ہے :

"No legislation will be done repugnant to the injunctions of the Quran and the Sunnah"

میں نے آج سے چار پانچ سال پہلے ملک کے مختلف شہروں میں "خطباتِ خلافت" کے عنوان سے خطبات دیئے تھے۔ یہ سلسلہ کراچی سے شروع ہوا تھا اور پھر لاہور' راولپنڈی' پشاور' کوئٹہ اور فیصل آباد میں تین روزہ یا چار روزہ خطبات دیئے گئے تھے جو

آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں کے علاوہ بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع ہو گئے تھے۔ ان میں میرا خطبہ ثانی اسی سے متعلق ہے کہ عہد حاضر میں نظام خلافت جب قائم ہو گا تو اس کا سیاسی اور دستوری ڈھانچہ کیا ہو گا۔ میں نے انٹرنیشنل خلافت کانفرنس کے لئے بھی کوشش یہ کی تھی کہ مقررین حضرات میرے اس خطبے کو اصل موضوع بحث بنائیں' اس سے اگر اختلاف ہے تو بیان کریں کہ کیا اور کہاں اختلاف ہے؟ اور اگر میرے خیالات کی تائید ہے تو وہ بھی بیان کر دی جائے تو کوئی ایسی بری بات نہیں! اگر بات صحیح ہے تو تائید کیجئے اور اگر بات غلط ہے تو اس کی جگہ پر متبادل بات پیش کیجئے۔

میں نے جسٹس (ر) جاوید اقبال صاحب سے بھی بات کی تھی' انہوں نے وعدہ بھی کر لیا تھا' لیکن ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور اس وقت وہ صاحب فراش ہیں۔ اگرچہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ میں اپنی رائے dictate کرا دوں گا لیکن پھر اس سے بھی مجبوراً معذرت کر لی۔ جسٹس نسیم حسن شاہ صاحب سے بھی میں نے خاص طور پر درخواست کی تھی۔ انہوں نے کانفرنس میں جو تقریر کی اس میں میری تمام باتوں کی تائید کی' اگرچہ حوالہ نہیں دیا۔ جسٹس (ر) تنزیل الرحمٰن صاحب سے میں نے کراچی میں بات کی تھی' انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ "میں لکھ تو نہیں سکتا البتہ میں نے آپ کا خطبہ پڑھ لیا ہے اور میں اس سے صد فیصد متفق ہوں' آپ میرا اتفاق کوٹ (quote) کر سکتے ہیں اور لوگوں کے سامنے بیان کر سکتے ہیں کہ مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں"۔ ارشاد احمد حقانی صاحب سے بھی میں نے اصل میں اسی کی درخواست کی تھی لیکن وہاں انہوں نے بھی اس موضوع پر تقریر نہیں کی البتہ ایک دوسرے موضوع پر ایک اچھی بات کہی۔ میں نے ان سے ٹیلی فون پر شکوہ کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ نے جو چیزیں بیان کی ہیں وہ تو متفق علیہ چیزیں ہیں' حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اتنی متفق علیہ نہیں ہیں۔ ہمارے مذہبی طبقات اس بات کو کیسے گوارا کر لیں گے کہ اجتہاد پارلیمنٹ کرے گی۔ وہ تو شاید کہیں کہ یہ تو کفر کا کلمہ ہے' پارلیمنٹ میں کوئی علماء یا مفتی حضرات بیٹھے ہوتے ہیں؟ لہٰذا یہ بات اتنی متفق علیہ نہیں ہے۔ بہرحال انہوں نے اس کو پڑھ کر یہی محسوس کیا کہ یہ تو سامنے کی چیزیں ہیں' بالکل واضح ہیں' ان میں کوئی شک نہیں ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کہتے ہیں کہ پارلیمنٹ کا اجتہاد آخری اور لازمی

(BINDING) ہو گا۔ یہ ان کی غلطی ہے۔ میرے نزدیک "پارلیمنٹ اجتہاد کرے گی" کا مطلب یہ ہے کہ کون سا اجتہاد نافذ ہو گا اور کتاب قانون کا جزو بنے گا اس کا فیصلہ پارلیمنٹ کرے گی۔ اجتہاد تو علماء ہی کریں گے، لیکن کس کا اجتہاد نافذ ہو گا اور قانون کی شکل اختیار کرے گا اس کا فیصلہ پارلیمنٹ کرے گی۔ البتہ آیا یہ اجتہاد قرآن و سنّت کے دائرے کے اندر اندر ہے یا تجاوز کر گیا ہے اس کا فیصلہ سپریم کورٹ کرے گی۔ فی الحال عبوری دور کے لئے فیڈرل شریعت کورٹ بنائی گئی ہے اور اس کے فیصلے کے خلاف اپیل سپریم کورٹ کے شریعت اپیلیٹ بنچ میں ہو سکتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب اس کے قائل نہیں ہیں۔ پہلے تو قائل نہیں تھے، ہو سکتا ہے ان کے اس موقف میں کوئی تبدیلی آ گئی ہو۔ کچھ عرصہ قبل وہ افغانستان گئے تھے، وہاں سے آنے کے بعد انہوں نے جو باتیں کہی تھیں ان سے اندازہ ہوا تھا کہ ان کی سوچ میں تبدیلی آئی ہے۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا تھا کہ جب میں نے وہاں جا کر افغانستان کے چیف جسٹس سے اجتہاد کے بارے میں بات کی تو انہوں نے کورا جواب دیا کہ ہم اجتہاد کے قائل نہیں ہیں، ہمارے پاس فقہ حنفی موجود ہے جو ہر طرح کفایت کرتی ہے، ہم تو اس کے مطابق فیصلے کرتے ہیں۔ (اللہ اللہ خیر سلّا)

بہرحال یہ باتیں میں صرف اس اعتبار سے کہہ رہا ہوں کہ یہ باتیں اتنی متفق علیہ نہیں ہیں۔ ابھی ضرورت ہے کہ علماء کے حلقے میں سے کچھ لوگ اس پر محنت کریں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے خاص طور پر مولانا سمیع الحق صاحب سے یہ وعدہ لیا تھا کہ وہ آئیں گے تو اسی موضوع پر تقریر کریں گے۔ وہ بتائیں کہ اس میں کیا چیز غلط ہے کیا صحیح ہے۔ چونکہ علماء کے حلقے سے اس بات کی تائید اگر آئے تو وہ بڑی اہمیت کی حامل شے ہو گی۔ پھر طالبان بھی اس پر توجہ کریں گے اور سنجیدگی کے ساتھ غور کریں گے۔ لیکن افسوس کہ وہ اپنی ایک مصروفیت کی وجہ سے آ نہیں سکے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ میرا یہی خطبہ کہ دورِ حاضر میں اگر کوئی اسلامی ریاست قائم ہوتی ہے تو اس کا دستوری آئینی ڈھانچہ کیا ہو گا، اس پر ہم ایک مستقل سیمینار منعقد کروائیں جس میں جدید ماہرین قانون و دستور اور علماء کرام کو دعوت خطاب دیں گے۔

پاکستان اور جمہوریت کا باہمی تعلق

یہ "جمہوریت' اسلام اور پاکستان" کی بحث کی ایک جہت (dimension) تھی۔ دوسری dimension یہ ہے کہ پاکستان اور جمہوریت کا کیا تعلق ہے؟ میں اس مسجد دارالسلام میں ۱۹۷۷ء سے خطبہ جمعہ دے رہا ہوں' یعنی اس کو چوبیس برس ہو گئے ہیں۔ اس عرصے میں نہ معلوم میں نے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ پاکستان کے ناطے سے اسلام اور جمہوریت دونوں لازم و ملزوم ہیں' نقیض ہونا چہ معنی دارد؟ اور میں نے اس کے لئے جو تشبیہہ دی ہے' آج میں نے اس پر غور کیا تو کچھ فخر کا سا احساس بھی ہوا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہہ رہا ہوں کہ اس کے لئے اس سے زیادہ بلیغ اور اس سے زیادہ بامعنی تشبیہہ ممکن نہیں۔ وہ یہ کہ "پاکستان کا باپ اسلام اور اس کی ماں جمہوریت ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان جمہوریت کے بطن سے وجود میں آیا۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کو اگر وہ فیصلہ کن حیثیت حاصل نہ ہوتی کہ تمام مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہی ہے تو پاکستان بن ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن یہ حیثیت مسلم لیگ کو کیوں حاصل ہوئی؟ اس لئے کہ نعرہ یہ لگایا گیا تھا کہ "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ"۔ یہ نعرہ نہ لگتا تو مسلم لیگ کو ووٹ نہ ملتے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ باپ نہ ہو تب بھی بیٹا نہیں ہو سکتا اور ماں نہ ہو تب بھی بیٹا وجود میں نہیں آ سکتا۔ اس حوالے سے پاکستان کا باپ اسلام اور ماں جمہوریت ہے۔ (باپ نہ ہونے کا صرف ایک استثناء حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ہے' اس کے علاوہ کوئی exeption نہیں)

پاکستان کا باپ اسلام اور ماں جمہوریت ہونے کی تشبیہہ اور اپنے اس موقف کے ساتھ مجھے گہری وابستگی ہے۔ اپنی اس commitment کی وجہ سے میں نے ۱۹۷۷ء کی تحریک کو "نظام مصطفیٰ تحریک" قرار نہیں دیا اور اسی وجہ سے مسجد خضرا سمن آباد' جہاں میرا خطبہ جمعہ اور درس قرآن لگ بھگ دس سال سے چل رہا تھا' وہاں کے لوگ مجھ سے ناراض ہوئے اور مجھے مسجد چھوڑنی پڑی۔ اس کے بعد میں نے طے کر لیا تھا کہ کسی مسجد میں خطاب نہیں کروں گا۔ اس لئے کہ اگر یہی پیش نظر رکھنا ہو کہ لوگ کیا سننا چاہتے ہیں اور کیا نہیں سننا چاہتے تو یہ میرا طریقہ نہیں ہے' میں تو وہ کہوں گا جو میں صحیح سمجھتا ہوں'

اور مسجدوں کے اندر یہ بات ممکن نہیں ہوتی۔ لیکن کرنل سلامت اللہ صاحب مرحوم میرے پاس تشریف لائے اور مجھے اس مسجد دارالسلام میں خطبہ جمعہ کی دعوت دی۔ میں نے انکار کیا۔ سردیوں کے دن تھے' وہ میرے دفتر کے باہر کرسی ڈال کر بیٹھ گئے کہ میں تو یہاں سے اٹھوں گا ہی نہیں جب تک کہ تم یہ نہیں مانو گے کہ تم یہاں پر خطبہ دو گے۔ وہ بزرگ آدمی تھے اور بہت طویل القامت اور گراں ڈیل انسان! یہ مسجد یہاں ان ہی کی بنائی ہوئی ہے۔ شاید آپ کے علم میں نہ ہو کہ کمشنر لاہور کے منہ پر انہوں نے طمانچہ رسید کر دیا تھا اور کمشنر بھی معمولی آدمی نہیں' سردار شوکت حیات خاں مرحوم کا بہنوئی تھا۔ وہ یہاں سرکاری دورے پر آیا تو مسجد تعمیر ہوتے دیکھ کر کہنے لگا کہ باغ میں مسجد کا کیا کام؟ کرنل صاحب مرحوم وہاں موجود تھے' انہوں نے اسے تھپڑ رسید کیا۔ الغرض کرنل سلامت اللہ اس طرح کے دبنگ آدمی تھے۔ بہرحال جب وہ ڈیرہ لگا کر بیٹھ گئے تو میں نے کہا ٹھیک ہے' سپر انداختیم' میں نے سپر ڈال دی۔ وہ دن اور آج کا دن' میں یہاں حاضر ہو رہا ہوں۔ اور یہاں کے نمازی گواہ ہیں کہ میں نے کتنی مرتبہ یہ بات کہی ہے کہ پاکستان کا باپ اسلام ہے' اور ماں جمہوریت!

ذوالفقار علی بھٹو کے لئے میرے اندر جو ایک نرم گوشہ تھا وہ اسی لئے تھا کہ وہ جمہوریت کا علمبردار تھا اور عوامی تحریک کے ذریعے سے برسراقتدار آیا تھا' کسی محلاتی سازش کے نتیجے میں نہیں آیا تھا۔ اس نے اس ملک کے اندر طوفان برپا کر دیا تھا۔ بہرحال اس سے ہمارا جو بھی نظریاتی اختلاف تھا اس سے قطع نظر وہ روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگا کر اقتدار میں آیا تھا۔ اسی لئے میں نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ یہ اِس وقت روحِ پاکستان کا امین ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ تحریک پاکستان کے جو اصل بنیادی محرک تھے ان میں سے اہم ترین معاشی مسئلہ تھا۔ ہندو کے غلبے کا خوف جو تھا اس میں یہ چیز بھی شامل تھی کہ ہندو معاشی طور پر ہمارا استحصال کرے گا۔ بھٹو نے اسی مسئلے کو اٹھایا اور روٹی' کپڑے' مکان اور انسانی حقوق کا نعرہ لگایا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ ہم بھارت کے ساتھ ہزار سالہ جنگ کریں گے۔ یہ بات تھی جس نے پنجاب کے عوام کے دلوں کے اندر گویا تحریک پاکستان کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

آج کل مرزا محمد منور مرحوم کے بارے میں بہت سے مضامین شائع ہو رہے ہیں۔

مجھے بھی ان سے بڑی نیاز مندی کا شرف حاصل رہا ہے اور ان سے بہت قرب رہا ہے۔ ہم کرشن نگر لاہور میں ایک ہی گلی میں رہتے تھے اور وہ میرا ہی ٹیلی فون استعمال کرتے تھے۔ اس حوالے سے بہت قرب تھا۔ ضیاء الحق صاحب کے بارے میں ان کا تصور تو یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ انہوں نے ضیاء صاحب کو ولی اللہ بنا دیا تھا اور بھٹو کے بارے میں وہ خیر کا ایک لفظ بھی سننے کے روادار نہیں تھے۔ وہ بھٹو سے انتہائی الرجک تھے۔ اس وجہ سے میرے اور ان کے درمیان کچھ تھوڑا سا فصل پیدا ہوا' ورنہ میرے اور ان کے بڑے قریبی روابط تھے۔ بہرحال بھٹو کے لئے اگر کوئی نرم گوشہ میرے دل میں تھا تو وہ اسی وجہ سے تھا کہ جمہوریت کو میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی ماں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸/ اگست ۱۹۸۰ء کو میری پہلی ملاقات ضیاء الحق کے ساتھ ہوئی تو میں نے ان سے جو تھوڑا سا وقت علیحدگی میں لے کر چند منٹ بات کی تھی اس میں اہم ترین بات یہی تھی کہ آپ الیکشن کے عمل کو غیر معیّنہ مدت کے لئے ہرگز ملتوی نہ کیجئے' یہ پاکستان کے لئے خودکشی کے مترادف ہے۔ پھر جب میں نے ۱۹۸۱ء میں ان کی شوریٰ میں شمولیت کی دعوت قبول کرلی تو شوریٰ کا فارن پالیسی پر جو Closed Door Session ہوا تھا' اس میں میں نے کھڑے ہو کر کہا کہ آپ جو پالیسی لے کر چل رہے ہیں وہ وہی ہے جو بھٹو نے بنائی تھی اور آپ اسے ٹھیک لے کر چل رہے ہیں' کوئی حرج نہیں' لیکن یہ کہ ملک کے اندر جو آپ کام کر رہے ہیں اس پر نظرثانی کیجئے۔ اگر زیادہ دیر تک آپ نے الیکشن کے process کو روکے رکھا تو آپ دہشت گردی اور Terrorism کو خود جواز فراہم کریں گے۔ اس زمانے میں غلام مرتضیٰ بھٹو پی آئی اے کا ایک جہاز ہائی جیک کروا کے کابل لے گیا تھا اور ایک بڑے سرکاری افسر کو اس نے اپنے ہاتھ سے قتل بھی کیا تھا۔ یہ باتیں آپ کو یاد ہوں گی۔ عین اس زمانے میں میں نے کہا تھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ انہیں جواز عطا کریں گے' کیونکہ لوگوں کے پاس اور کوئی راستہ نہیں رہے گا۔ میں نے شوریٰ کے اجلاس میں یہی بات کہی تھی کہ پی ایل او (Palestinian Liberation Organization) کی دہشت گردی کو ہم نے جواز کیوں دیا تھا اور انہیں چھاپہ مار کاروائیوں میں حق بجانب کیوں قرار دیا تھا' اس لئے کہ ان کے پاس کوئی راستہ رہا ہی نہیں' تو وہ کیا کرتے۔ آپ کسی آدمی کو دیوار سے لگا دیں تو وہ کچھ تو کرے گا۔ اسی طرح آپ نے الیکشن کے عمل کو

غیر معینہ مدت تک ملتوی کئے رکھا تو گویا کہ آپ یہاں دہشت گردی کے لئے جواز فراہم کر دیں گے۔

۱۹۸۲ء کے آخر میں مَیں نے ضیاء الحق صاحب کے نام کھلا خط لکھا تھا کہ آپ جس طرح مارشل لاء کا تسلسل لے کر چل رہے ہیں مجھے اندیشہ ہے کہ مستقبل کا مؤرخ کہیں یہ نہ لکھے کہ پہلے تو ۱۹۷۱ء میں پاکستان کو دولخت کیا تھا ایک شرابی اور زانی ٹولے (یحییٰ خان اینڈ کمپنی) نے اور اس کے بعد پاکستان کی مزید تقسیم ایک ایسے شخص کے ہاتھوں ہوئی جو نماز روزے کا پابند تھا اور جس کے کندھے پر مصلّٰی پڑا رہتا تھا۔ ۱۹۸۳ء میں سندھ کے اندر ایم آر ڈی کی تحریک اس قدر زوردار تحریک تھی کہ اگر اندرا گاندھی چوک نہ گئی ہوتی اور اس نے کہیں اس تحریک کی مدد کر دی ہوتی تو پاکستان اسی وقت ختم ہو جاتا اور سندھو دیش وجود میں آ جاتا۔ اس حوالے سے میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ پاکستان اور جمہوریت تو لازم ملزوم ہیں۔ پاکستان کا باپ اسلام ہے اور ماں جمہوریت ہے۔

پاکستان میں اسلام کا نفاذ

اس بحث کی تیسری جہت (dimension) پاکستان میں اسلام کا نفاذ ہے۔ سب سے پہلی بات جو میں خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ جمہوریت اس میں یقیناً ممدّ و معاون ہے۔ واضح رہے کہ میں الیکشن نہیں کہہ رہا' الیکشن تو جمہوریت کا ایک آلہ ہے' جمہوریت ایک مکمل نظام اور ایک وسیع تر شے کا نام ہے جس میں لوگوں کے حقوق ہوتے ہیں' اختلاف رائے کی آزادی ہوتی ہے' لوگ جماعت بنا سکتے ہیں' اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں مل کر جمہوریت وجود میں آتی ہے۔ الیکشن تو ان کی رائے کا ظہور کا ایک ذریعہ ہے۔ میرے نزدیک جمہوریت یقیناً پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام و نفاذ میں ممد و معاون ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ پورے عالم اسلام میں اگر کہیں واقعتاً عہد حاضر میں مثالی اسلامی ریاست کے قیام کا کوئی امکان ہے تو صرف اور صرف پاکستان میں ہے' اس لئے کہ یہاں جمہوریت ہے۔ اگرچہ یہاں مارشل لاء بھی آتے رہے ہیں جس کی بنا پر جمہوریت دب گئی ہے' لیکن اس کے باوجود جمہوریت بالکل ختم نہیں ہوئی۔ ضیاء

الحق کے دور میں بھی جمہوریت بالکل ختم نہیں ہو گئی تھی' اس میں بھی اظہار رائے کی آزادی تھی' ایم آر ڈی جیسی تحریک موجود تھی' اس پر پابندی تو عائد نہیں کی گئی تھی۔ اب اگر مسلمان اسلام کے لئے کام نہ کریں اور جمہوریت کی تحریک چلاتے رہیں تو یہ ان کا اپنا فیصلہ ہے۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ یہاں احتجاج' مطالبات اور اظہار رائے کے راستے کبھی بند تو نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام میں اسلامی نظام کے قیام کا جس قدر امکان یہاں ہے' کہیں اور نہیں ہے۔

زاہد الراشدی صاحب گوجرانوالہ کے اہم عالم دین ہیں۔ ان کے حوالے سے میں یہ بات پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ایک مرتبہ لندن میں اسلامی ممالک کی بہت سی اسلامی تحریکوں کے لوگ جمع تھے اور ان میں اس بات پر اتفاق رائے (consensus) ہوا کہ دنیا میں اسلام کے نفاذ کا امکان اگر کہیں ہے تو پاکستان ہی میں ہے' اور کہیں نہیں۔ یہی وجہ ہے حزب التحریر اور المہاجرون جیسی تحریکوں کے لوگ اب پاکستان کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہے ہیں اور یہاں اپنا لٹریچر پھیلا رہے ہیں۔ ان کے ایک نوجوان مقرر عبدالرحمٰن سلیم کو تو ہم نے اپنی کانفرنس میں بھی بلایا تھا۔ یہ جوشیلے لوگ کہاں سے آ گئے ہیں؟ اب تک تو ان کی تمام سرگرمیاں یورپ' امریکہ اور انگلستان میں تھیں' اب وہ پاکستان آئے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عالم اسلام میں کہیں اور جانے کا تو امکان ہی نہیں ہے' فوراً پکڑے جائیں گے اور جیل میں ٹھونس دیئے جائیں گے۔ وہاں ان کا داخلہ ہی ممکن نہیں۔ ان کو اگر کوئی امکان نظر آتا ہے تو وہ صرف پاکستان میں نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے جمہوریت اسلامی نظام کے قیام میں ممد و معاون ہے' لیکن انتخابات ہرگز کسی درجے میں ممد نہیں ہیں' بلکہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ محض Exercise in futility ہیں۔ اس کے بارے میں بھی میں آج ذرا تفصیلاً بات کرنا چاہتا ہوں۔

نفاذ اسلام سے مراد کسی کے ذہن میں اگر یہ ہے کہ کچھ عبادات' کچھ تقریبات' کچھ شعائر اور کچھ حدود کی تنفیذ ہو جائے تو اس حد تک انتخابات کے ذریعے بھی ممکن ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ نفاذ اسلام کے ہمارے یہاں دو تصور پائے جاتے ہیں۔ ایک تو نظام عدل اجتماعی (System of Social Justice) کے قیام کا قرآنی تصور ہے:

﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ یہ ایک ہمہ گیر اور وسیع تصور ہے۔ جبکہ ایک تصور یہ ہے کہ نماز روزہ کی پابندی ہو' مسجدیں عالی شان ہوں' عید میلاد النبیؐ ٹھاٹ سے منائی جارہی ہو' سرکاری سطح پر بھی اور صوبائی سطحوں پر بھی جلوس نکل رہے ہوں' عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے اجتماعات ہوں' اسلامی تقریبات جتنی بھی ممکن ہوں منائی جارہی ہوں' شعائر اسلام کا احترام ہو' رمضان المبارک میں سڑک پر کوئی کھاتا ہوا نہ ملے۔ اگر تو اسی حد تک اسلام کو محدود رکھنا ہے تو یہ الیکشن کے ذریعے بھی ممکن ہے۔ اس حد تک اسلام تو سعودی عرب میں بھی ہے' لیکن کیا سعودی عرب میں اسلام کا نظام عدل اجتماعی موجود ہے؟ وہاں تو ملوکیت ہے' عوام کو تو رائے دینے کا حق ہی حاصل نہیں۔ وہاں کے شہزادوں کا ایک ایک محل اربوں اور کھربوں ڈالر کا بن رہا ہے جبکہ غریب آدمی وہاں بھی جھونپڑیوں میں رہ رہا ہے۔ یہ تو اسلام نہیں ہے۔ یہ تو اسلام کا محدود اور مسخ شدہ تصور ہے۔ اس کے نفاذ میں تو الیکشن کے ذریعے سے کوئی رکاوٹ نہیں آتی۔ اس لئے کہ اس سب میں استحصالی طبقات کا فائدہ ہے' ان کا کچھ بھی نقصان نہیں ہے۔ وہ حرام خور جنہوں نے کروڑوں روپے اپنے پاس جمع کئے ہوئے ہیں اور جائیدادیں بنائی ہوئی ہیں انہیں اسلامی سزاؤں سے کوئی اندیشہ لاحق نہیں ہے۔ اگر یہاں چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا نافذ کر دی جائے تو چوری یہاں ختم ہو جائے گی مگر تحفظ کس کو ملے گا؟ ان حرام خوروں کی دولت محفوظ ہو جائے گی۔ قطع ید کی سزا سے عوام کو کیا ملے گا؟ یہ تو جن کے اربوں جمع ہیں وہ اربوں روپے محفوظ ہو جائیں گے۔ ڈاکہ ختم کر دیجئے' حرام خوروں کی دولت محفوظ ہو جائے گی۔ لہٰذا انہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا کہ اس قسم کا اسلام آپ لے آئیں۔ لیکن اگر آپ عدل اجتماعی والا اسلام لانا چاہتے ہیں جس کی تعبیر اقبال نے اس طرح بھی کی تھی کہ مارکسزم + خدا = اسلام تو یہ اسلام الیکشن کے ذریعے کبھی بھی نہیں آسکتا۔

اسلام کے نظام عدل اجتماعی کے بارے میں علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں کہا تھا کہ "اگر ہندوستان میں ایک آزاد اسلامی ریاست قائم ہو گئی تو ہمیں موقع مل جائے گا کہ عرب ملوکیت کے دور میں اسلام کے رخ روشن پر جو بدنما داغ پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر ہم دنیا کے سامنے اسلام کو اس کی اصلی شکل میں پیش کر سکیں"۔ اور ظاہر بات ہے کہ دورِ بنو اُمیّہ اور دورِ بنو عباس یعنی دورِ ملوکیت سے پہلے کا اصل اسلام دور خلافت راشدہ

کا تھا۔ اور اسی کے بارے میں قائداعظم نے "اسلامک سوشلزم" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ قائداعظم کے تصور اسلام کے بارے میں ان کے ذاتی معالج ڈاکٹر ریاض علی شاہ کی روایت ہے کہ وفات سے قبل قائداعظم نے اپنے آخری وقت میں یہ الفاظ کہے تھے :

"میں بہت مطمئن ہوں، تمہیں اندازہ نہیں ہو سکتا کہ مجھے کتنا اطمینان ہے کہ پاکستان قائم ہو گیا۔ اور یہ کام میں تنہا نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ رسولؐ خدا کا فیض شامل نہ ہوتا۔ اب یہ پاکستانی مسلمانوں کا کام ہے کہ یہاں خلافت راشدہ کا نظام قائم کریں"۔

اس روایت کے گواہ ڈاکٹر ریاض علی شاہ ہیں جو میرے اپنے استاد بھی تھے۔ وہ پروفیسر آف ٹیوبرکلوسز (Professor of Tuberculosis) تھے۔

اسلام کا عادلانہ نظام اگر آپ قائم کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے سب سے پہلا قدم یہ ہو گا کہ جاگیرداری اور زمینداری کا خاتمہ کیا جائے، جو الیکشن کے ذریعے سے ناممکن ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا۔

ده خدایا یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آباء کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں!

اور۔

خدا آں ملّتے را سروری داد
کہ تقدیرش بدستِ خویش بنوشت
بآں قومے سروکارے ندارد
کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

یعنی اللہ تعالیٰ اُسی قوم کو عزت و سرفرازی عطا کرتا ہے جو اپنی تقدیر اپنے ہاتھ سے تحریر کرتی ہے، جبکہ اللہ کو اس قوم سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا جس کا دہقان کسی اور کے لئے ہل چلا رہا ہو۔ محنت وہ کرے گا، خون پسینہ اس کا ایک ہو گا، مئی اور جون کی حبس والی گرمی کے اندر فصل وہ کاٹے گا، لیکن جب فصل پک کر تیار ہو گی تو اس میں سے Lions's share آکر زمیندار اور جاگیردار لے جائے گا۔ اگر اس نظام کو قائم رکھتے ہوئے اس پر اسلام کی ٹیپ ٹاپ کرنی ہے تو اور بات ہے، لیکن اگر اس نظام کو ختم کرنا ہے

تو وہ کبھی بھی انتخابات کے ذریعے سے ممکن نہیں۔ آپ کے ستر' اسّی فیصد ووٹ تو جاگیرداروں' وڈیروں اور خوانین کے قبضے میں ہوتے ہیں لہٰذا الیکشن کے ذریعے سے اسلام کے نظام عدل اجتماعی کے قیام کا کوئی امکان نہیں۔ اس اعتبار سے انتخابات لاحاصل ہیں۔ آپ انتخابات اعلیٰ سے اعلیٰ' عمدہ سے عمدہ کرالیں' شفاف اور منصفانہ کرالیں' لیکن نتیجہ کیا ہو گا؟ پھر وہی وڈیرے اور وہی جاگیردار برسراقتدار آئیں گے۔ چچا نہیں تو بھتیجا' بھتیجا نہیں تو چچا' ایک بھائی نہیں تو دوسرا' ایک مزاری نہیں تو دوسرا مزاری' ایک لغاری نہیں تو دوسرا لغاری آجائے گا۔ ایک کے بعد دوسرے قریشی' جیلانی' جتوئی' کھوسو یہی لوگ آئیں گے۔ جس شاخ پر ان کا صرف بسیرا ہی نہیں محل بنا ہوا ہے بھلا اسے وہ کاٹنے دیں گے؟ اس کے لئے انقلاب کی ضرورت ہے۔ جس کے لئے میری تجویز یہ ہے کہ دینی جماعتیں جمع ہوں' اس پاور پالیٹکس سے withdraw کریں اور ایک پریشر گروپ بن کر انقلاب کا راستہ اختیار کریں۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ ۱۹۵۱ء کے الیکشن میں جماعت اسلامی نے جب پہلی مرتبہ حصہ لیا تھا تو اُس وقت مَیں میڈیکل کالج کا طالب علم تھا۔ عبداللہ شاکر ان دنوں پنجابی میں بڑی اچھی نظمیں لکھتے تھے۔ ان کی ایک نظم تھی ؏

ہن فیر مداری آون گے!!

ہم جمعیت کے ساتھی تانگے میں بیٹھ کر ترنم کے ساتھ یہ نظم پڑھا کرتے تھے اور "تسنیم" کا خاص شمارہ بیچا کرتے تھے۔ یہ کام میں نے عام کارکن کی حیثیت سے کیا ہے۔

ہن فیر مداری آون گے!!

یعنی اب یہ الیکشن ہو گا' پھر مداری آئیں گے اور کھیل دکھائیں گے۔

میں یہ باتیں اس لئے زور دے کر کہہ رہا ہوں کہ اب دوبارہ کچھ چہل پہل شروع ہوئی ہے اور بازار سیاست کی رونقیں بحال ہو رہی ہیں۔ اس لئے کہ ظاہر بات ہے اگلے سال تو آخر کچھ نہ کچھ ہونا ہی ہے۔ لہٰذا دینی جماعتیں الیکشن میں حصہ لینے کے بارے میں اپنی پالیسیوں پر غور کریں۔ جو لوگ الیکشن میں حصہ لیں انہیں لینے دیجئے کیونکہ پاکستان کے لئے انتخابی عمل ناگزیر اور لازم ہے اور میرے نزدیک اس کا معاملہ سانس کی آمد و شد کا سا ہے جس پر زندگی اور موت کا انحصار ہے۔ لیکن جہاں تک اسلام کے نظام عدل اجتماعی

کا تعلق ہے' وہ الیکشن کے ذریعے سے ہرگز نہیں آئے گا۔ اُس وقت تک نہ سرمایہ داری کی جڑ کٹے گی اور نہ سود کا مکمل انسداد ممکن ہے جب تک مکمل انقلاب نہ آئے۔ اس سلسلے میں تھوڑی بہت پیش رفت بھی ہو جائے تو اسے میں غنیمت سمجھتا ہوں۔ اس لئے غیر سودی بینکاری کی سکیمیں آتی ہیں تو میں ان کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ چلئے' سود میں کچھ تو کمی آئے گی' لیکن سود کا مکمل خاتمہ مکمل انقلاب کے بغیر ممکن ہے۔

میں جناب مجید نظامی اور ادارۂ نوائے وقت کا اس اعتبار سے بہت قدر دان ہوں کہ پاکستان کی محبت گویا ان کے ایمان کا جزو ہے اور تحریک پاکستان میں نوائے وقت کا بہت فعال کردار رہا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں ہم نوائے وقت کے انتظار میں حصار ریلوے سٹیشن پر کھڑے ہوتے تھے اور گاڑی آتی تھی تو وہیں سے نوائے وقت کا بنڈل لیتے تھے اور شہر کے اندر گھوم جاتے تھے کہ ہاکرز کے ذریعے پہنچنے میں شاید دیر ہو جائے۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ خود نوائے وقت کے شذرہ نگار نے بھی اپنے شذرے کے آخر میں یہی لکھا ہے اگر دینی جماعتیں پریشر گروپ بنا کر یہ کام کریں تو پارلیمنٹ بھی کر دے گی۔ شذرہ نگار کی یہ بات بالکل درست ہے۔ لیکن اگر دینی جماعتیں بھی اس بندر بانٹ میں لگی رہیں اور وہ ووٹ مانگنے کے لئے کاسہ گدائی لوگوں کے سامنے رکھیں تو ان کو ملنے والے ووٹ بھی تقسیم ہوتے چلے جائیں گے۔ کچھ جے یو آئی کو ملیں گے تو کچھ جماعت اسلامی کو اور کچھ اہلحدیث حضرات کے مختلف دھڑوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔

اگر دینی ووٹ بھی تقسیم ہو جائیں گے تو اسلام کیسے آئے گا؟ اس کے لئے تو دینی جماعتوں کو پریشر گروپ بنا کر اور اس سے آگے بڑھ کر سول نافرمانی اور پُرامن ایجی ٹیشن کا راستہ اختیار کرنا چاہئے کہ کسی کے مال و جان کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے' ساری قربانی خود دینے کو تیار ہوں۔ وہ یہ عزم کر کے میدان میں نکلیں کہ اس راستے میں ماریں پڑتی ہیں تو ہم برداشت کریں گے اور جانیں قربان کرنی پڑتی ہیں تو ہم قربان کریں گے' لیکن کسی کی جان نہیں لیں گے۔ اس انداز سے پُرامن ایجی ٹیشن کے ذریعے حکمرانوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا جائے۔ انہوں نے بھی مثال دی ہے اور میں اس مثال کو صحیح سمجھتا ہوں کہ قرارداد مقاصد بھی آخر اسی طرز سے پاس ہوئی تھی۔ اور وہ بھی اس لئے ہو گئی تھی کہ اُس وقت تک جماعت اسلامی نے الیکشن میں حصہ نہیں لیا تھا اور وہ اس معنی میں سیاسی

جماعت نہیں تھی۔ لہٰذا مولانا مودودی جو مطالبہ لے کر اٹھے، تمام دینی جماعتوں اور دینی شخصیتوں نے اس کی تائید کی۔ بہرحال اس موضوع پر جس پر میں نے آج گفتگو کی ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ ایک سیمینار منعقد کرانے کی کوشش کروں گا۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○

فہم قرآن میں اضافے کے لیے فنی کتاب "قواعدِ زبان قرآن" کا مطالعہ کیجیے۔

1	قواعد زبان قرآن ۔ دوسرا ایڈیشن	خلیل الرحمٰن چشتی	250 روپے
2	درس قرآن کی تیاری کیسے کی جائے ؟	خلیل الرحمٰن چشتی	15 روپے
3	حدیث کی اہمیت وضرورت	خلیل الرحمٰن چشتی	35 روپے
4	نصاب برائے حفظ		30 روپے
5	تزکیۂ نفس		25 روپے
6	توحید اور شرک	محمد خان منہاس	15 روپے
7	رسالت	محمد خان منہاس	15 روپے
8	آخرت کا تصور	محمد خان منہاس	15 روپے
9	نماز	محمد خان منہاس	15 روپے
10	انفاق فی سبیل اللہ		15 روپے
11	مؤثر ابلاغ	محمد خان منہاس	10 روپے

گیارہ (11) کتابوں کے مکمل سیٹ کی قیمت مع ڈاک خرچ-/470 روپے ہے۔
کتابیں وی۔پی نہیں کی جائیں گی۔ منی آرڈر یا ڈرافٹ کا پہلے آنا لازمی ہے۔

الفوز اکیڈمی ، اسلام آباد	317, Street 16, F-10/2, Islamabad
Fax : 051- 22 54 139	Tel. : 051- 22 51 933

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں

توحیدِ عملی

کا فریضۂ اقامت دین سے ربط و تعلق

سورۃ الشوریٰ آیات ۳۶ تا ۵۰ کی روشنی میں

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد
مرتب : شیخ جمیل الرحمٰن مرحوم

(آخری قسط)

اقامتِ دین کی جدّوجُہد کرنے والوں کے مزید مطلوبہ اوصاف

آگے اقامت دین کی جدوجہد کرنے والوں کے لئے چار مزید اوصاف کا بیان آ رہا ہے۔ فرمایا :

﴿ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ ﴾

"اور جو لوگ اپنے رب کے حکم پر لبیک کہتے ہیں' اور نماز قائم کرتے ہیں اور اپنے معاملات باہم مشورے سے چلاتے ہیں' اور جو کچھ بھی رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں"۔

پہلا وصف : استجابت

اجابت اور استجابت ہم معنی الفاظ ہیں۔ اجابت قبولیت کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۶ اور سورۃ البقرہ کی آیت ۱۸۶ میں استعمال ہوا ہے۔ فارسی کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن — اجابت از در حق بہر استقبال می آید!

اس کا ترجمہ بھی شعر ہی میں ہے ؎

ڈرو مظلوم کی آہوں سے جب اٹھتی ہیں سینوں میں
قبولیت ہے کرتی خیر مقدم چرخ سے آکر!

سورۃ البقرہ کی آیت سے صاف واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ دو طرفہ معاملہ ہے' فرماتا ہے : ﴿ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ﴾ "میں تو ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں اور قبول کرتا ہوں جب بھی اور جہاں بھی وہ مجھے پکارے"۔ میں نے کوئی خاص وقت مقرر نہیں کیا ہوا ہے کہ بس صرف اس میں انٹرویو ہو سکتا ہے یا درخواست سنی جا سکتی ہے یا پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن ایک شرط ہے : ﴿ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ ﴾ "پس میرے بندوں کو بھی چاہئے کہ میری پکار پر لبیک کہیں (میری ہدایات کو قبول کریں) اور مجھ پر ایمان رکھیں"۔ یہ نہیں کہ اپنی باتیں تو مجھ سے منوائیں اور میری نہ سنیں۔ یہاں فرمایا : ﴿ وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّھِمْ ﴾ "جن لوگوں نے اپنے رب کی پکار پر لبیک کہا' اسے قبول کیا"۔ کونسی پکار؟ یہ کہ دین کو قائم رکھو یا دین کو قائم کرو اور اس دین کے بارے میں متفرق نہ ہو جاؤ' دین کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دو۔

دوسرا وصف : اقامت صلوٰۃ

﴿ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ﴾ "اور انہوں نے نماز قائم کی"۔ دین اللہ کا ہے اور اس کو قائم کرنے کے لئے آپ کے دل میں اتنا ہی شدید جذبہ ہو گا جتنی اللہ کی محبت آپ کے دل میں ہو گی۔ فرض کیجئے کہ کوئی دولت کا پجاری ہے اور وہ دن رات اس کے لئے محنت کر رہا ہے تو جتنی اسے دولت سے محبت ہو گی' اتنی ہی وہ محنت کرے گا۔ محبت کم ہو گی تو مشقت بھی کم ہو جائے گی۔ اگر اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرنی ہے تو اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط رکھنا ہو گا۔ اور تعلق مع اللہ کی مضبوطی کے لئے جو ستون ہے' جو عماد الدین ہے' وہ ہے نماز۔ لہٰذا فرمایا گیا : ﴿ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ﴾ "اور انہوں نے نماز کو قائم رکھا"۔ یہ نماز درحقیقت اللہ تعالیٰ سے تعلق اور اللہ کی یاد کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ فرمایا : ﴿ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ﴾ "نماز قائم کرو میری یاد کے لئے"۔ اللہ کے ساتھ تعلق میں اگر کہیں ذرا کمی آنے لگے تو اسے تازہ کرنے کے لئے نماز ہی سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ حفیظ جالندھری کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

سرکشی نے کر دیئے دھندلے نقوش بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں!

ایک بندۂ مومن نے اللہ تعالیٰ سے جو عہد بندگی استوار کیا ہوا ہے سجدے میں جا کر گویا وہ اس عہد کو از سرِ نو تازہ کرتا ہے۔ علامہ اقبال کا یہ شعر بھی خوب ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق!

مومن اس دُنیا میں رہتے ہوئے دُنیا سے بلند تر ہو کر زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کا اصل تعلق صرف اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ پس نماز اللہ سے تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

تیسرا وصف : شورائیت

﴿ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ اب جو اقامت دین کی جدوجہد کرنی ہے، کفر سے ٹکرانا ہے، باطل کا استیصال کرنا ہے، حق کا بول بالا کرنا ہے، غلبۂ دین کے فریضہ کو انجام دینا ہے، اس کے لئے ایک شرط لازم یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس کام کے لئے جمع ہوئے ہوں، منظم ہوئے ہوں، وہ باہمی مشورے کا نظام قائم کریں۔ کسی میں انانیت نہ آنے پائے۔ اس میں کوئی Totalitarianism نہ ہو کہ بس میں مختارِ کل ہوں۔ یہ بات اگر ہو سکتی تھی تو انبیاء و رسل کے لئے ہو سکتی تھی جن کا تعلق تارِ وحی کے ذریعے اللہ کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ جب رسولوں نے یہ نہیں کیا تو ہما شما کس قطار و شمار میں ہو سکتے ہیں۔

سورۂ آلِ عمران میں فرمایا : ﴿ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ﴾ "(اے محمد ﷺ) اپنے ان ساتھیوں سے مشورہ لے لیا کیجئے"۔ ان کو بھی مشورہ میں شریک کر لیا کیجئے۔ ﴿ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ﴾ مشورے کے بعد جو آپؐ فیصلہ کر لیں تو اس پر اللہ پر توکل کرتے ہوئے عمل کریں۔ پھر یہ نہیں ہونا چاہئے کہ فیصلہ بدل دیا جائے کہ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ دعوتِ توحید عملی کے داعی اور تحریک اسلامی کے قائد کے لئے عزیمت لازمی ہے۔ مشورہ ضرور کرے، پھر فیصلہ کرے، لیکن جب فیصلہ کر لیا جائے تو معاملہ اللہ کے حوالہ کر دیا جائے۔ ﴿ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ﴾ اسی کی مثال ہمیں غزوۂ احد کے واقعہ میں ملتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مشورہ کیا کہ دشمن مدینہ پر چڑھائی کے لئے آ رہا

ہے' کیا کرنا چاہئے؟ حضور ﷺ کی اپنی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں محصور ہو کر مدافعت کی جائے جیسے قریباً دو سال بعد غزوۂ احزاب کے موقع پر ہوا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین کی رائے بھی یہی تھی۔ رائے میں تو اتفاق ہو سکتا ہے' چاہے کوئی شخص نیک نیتی سے رائے دے رہا ہو یا بدنیتی سے۔ لیکن کچھ مسلمانوں نے' خاص طور پر انہوں نے جو غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے یا بعد میں اسلام لائے تھے جن میں جوشِ جہاد بہت تھا' اصرار کیا کہ ہم قلعہ بند ہو کر مدافعت کیوں کریں؟ ہمیں تو شہادت مطلوب ہے ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

تو کیوں نہ میدان میں جا کر کفر سے مقابلہ کریں؟ نبی اکرم ﷺ نے اپنے چند ساتھیوں کا جب یہ جوش و خروش دیکھا تو فیصلہ فرمایا دیا کہ میدان ہی میں مقابلہ ہو گا۔ اس کے بعد آپؐ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں تشریف لے گئے اور باہر وارد ہوئے تو زرہ بکتر پہنی ہوئی اور ہتھیار لگائے ہوئے تھے۔ یہ بڑی غیر معمولی بات تھی' آپؐ نے کبھی یہ صورت اختیار نہ کی تھی۔ اب ان ساتھیوں کو احساس ہوا کہ جن کا میدان میں مقابلہ کرنے پر اصرار تھا کہ ہم سے غلطی ہوئی ہے۔ کوئی خاص بات ہے جو حضور ﷺ زرہ پہن کر تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے کہا حضور ﷺ ہم اپنی بات واپس لیتے ہیں' اب جو بھی آپؐ کا فیصلہ ہو ـــــ حضور ﷺ نے فرمایا : کسی نبی کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ ہتھیار لگا کر اتار دے۔ حضور ﷺ نے میدان ہی میں چلنے کا فیصلہ برقرار رکھا۔ توکل تو اللہ ہی پر ہے' ہو گا وہی جو وہ چاہے گا' وہ چاہے تو ہماری غلطیوں کو Condone کر دے' ان کی تلافی فرما دے۔ بلکہ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ غلطی آپ کے حق میں مفید ہو جاتی ہے فیصلہ تو اس کا ہوتا ہے۔ یہ بات ہے جو یہاں فرما دی گئی کہ ﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ﴾ اے نبی یہ تو اللہ کا بڑا فضل ہے اور اس کی رحمت ہے کہ آپؐ اپنے ساتھیوں کے حق میں بہت نرم خو ہیں۔ اگر آپؐ تند خو ہوتے تو یہ آپؐ کے اردگرد سے منتشر ہو جاتے۔ اقبال نے کہا ہے ؎

کوئی کارواں سے چھوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!

کسی قافلہ کو لے کر چلنے کے لئے قائد میں خوئے دلنوازی بھی ضروری ہے اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ میں یہ وصف اپنے عروج پر تھا کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ حضور ﷺ کی سب سے زیادہ عنایت میری طرف ہے' سب سے زیادہ توجہ میری جانب ہے۔ تو فرمایا اگر خدانخواستہ آپؐ کا طرز عمل یہ ہوتا کہ آپؐ تند مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ سب ساتھی اِدھر اُدھر بکھر چکے ہوئے' منتشر ہو چکے ہوتے۔ ﴿ فَاعْفُ عَنْهُمْ ﴾ پس آپؐ ان کی خطاؤں سے درگزر کیا کیجئے۔ ﴿ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ ﴾ اور اللہ سے بھی ان کے لئے استغفار کیا کیجئے۔ ﴿ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ﴾ اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہا کیجئے۔ ﴿ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ﴾ اور جب آپؐ فیصلہ کرلیں تو پھر اللہ پر توکل کیجئے۔

یہاں فرمایا : ﴿ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ﴾ یہ اس لئے کہ ایک قافلہ' ایک جماعت' ایک تنظیم کے ہم مقصد ساتھیوں میں ایک دوسرے کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی اور یک جہتی ہونی لازم ہے۔ وہ پیدا نہیں ہوگی اگر مشورہ نہ ہو۔ حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا کہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ لیا کیجئے' تا بہ دیگراں چہ رسد! دوسرا کون کہہ سکتا ہے کہ میں مشورہ سے مستغنی ہوں۔ لہٰذا ہمیشہ ہمیش کے لئے طے فرمادیا گیا : ﴿ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ﴾

چوتھا وصف : انفاق

اس آیت میں اقامت دین کا فریضہ انجام دینے والوں کا چوتھا وصف بیان ہو رہا ہے : ﴿ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝ ﴾ "ہم نے انہیں جو بھی رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں"۔ آیت کے اس حصہ کی توضیح و تشریح سے قبل اب تک جو کچھ ذکر ہوا اس پر نگاہ بازگشت ڈال لیجئے۔ پہلی آیت میں تین اوصاف بیان ہوئے تھے۔ (۱) دُنیا کو صرف برتنے کی چیز سمجھنا۔ (۲) آخرت کی زندگی ہی کو اصل خیر اور باقی رہنے والی شے جاننا۔ (۳) اللہ تعالیٰ ہی پر توکل کرنا۔ دوسری آیت میں بھی تین اوصاف آئے ہیں۔ (۱) کبیرہ گناہوں سے اجتناب۔ (۲) فواحش سے پرہیز۔ (۳) غصہ کی حالت میں عفو و درگذر سے کام لینا۔

زیر نظر آیت میں اب تک تین اوصاف ہمارے سامنے آئے ہیں : (۱) دعوتِ

اقامتِ دین پر لبیک کہنا' (۲) نماز کو قائم کرنا' (۳) اپنے معاملات میں مشاورت کرنا۔ گویا اب تک نو اوصاف سامنے آ چکے ہیں۔ اب دسواں وصف سامنے آ رہا ہے اور وہ ہے : ﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ ﴾ ہم نے انہیں جو بھی رزق دیا ہے' وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہاں تک دس اوصاف پورے ہوتے ہیں۔

چونکہ اکثر لوگ بنیادی باتوں سے واقف نہیں ہیں اس لئے ان کے ذہن کی رسائی یہاں پر يُنْفِقُوْنَ (خرچ کرنے) کے اصل اور حقیقی مفہوم تک نہیں ہو پاتی۔ دیکھئے خرچ تو سب ہی لوگ کرتے ہیں۔ دولت ہے' کمائی ہے' وہ آخر خرچ کرنے کے لئے ہی ہوتی ہے۔ بخیل سے بخیل آدمی بھی آخر کچھ نہ کچھ خرچ کرتے ہیں' بیٹیوں کو بھی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر اپنی بیٹیوں کی شادی کے مواقع پر تو وہ دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ مکان بناتے ہیں تو بھی دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ ایک ہے اپنی ذات پر' اپنی ضروریات پر خرچ کرنا۔ وہ یہاں مراد نہیں ہو سکتا' اس لئے کہ اس مقصد کے لئے تو سب ہی خرچ کرتے ہیں۔ یہاں اصل مراد ہو گی اللہ کے لئے خرچ کرنا۔

پھر اللہ کے لئے خرچ کرنے کی بھی تین مُدیں ہیں۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ اللہ کو راضی کرنے کے لئے آپ اپنا مال خرچ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی مد ایک ہے ذوی القربیٰ' یتامیٰ' مساکین' فقراء' بیوگان' مسافروں کی مدد کرنا' سائلوں کو دینا' جو مقروض ہوں ان کو قرض سے نجات دلانا' جو غلامی کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہوں ان کی گردنیں چھڑا دینا۔ جیسا کہ آیت بر (سورۂ بقرہ کی ۱۷۷ ویں آیت) میں فرمایا : ﴿ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ﴾ اس مد کو قرآن مجید کی اصطلاح میں صدقات و خیرات نافلہ کہا جاتا ہے۔ زکوٰۃ کو بھی اس میں شامل کر لیجئے' وہ فرض ہے اور یہ دوسری مد ہے۔ اس کی مدات اکثر تو یہی ہیں جو آیت بر میں بیان ہوئیں۔ کچھ کا ان میں اضافہ ہے۔

انفاق کی ایک تیسری مد ہے اور وہ ہے اللہ کے دین کے لئے خرچ کرنا۔ یعنی دین کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت میں پیسہ لگانا' اقامت دین کی جدوجہد کے لئے اپنا مال خرچ کرنا۔ اگر قتال فی سبیل اللہ کا مرحلہ آ جائے تو اس کے لئے سروسامان' اسلحہ وغیرہ کی

فراہمی میں دل کھول کر پیسہ خرچ کرنا۔ یہاں درحقیقت یہ تیسری مد مراد ہے' کیونکہ سیاق میں اَقِیْمُوا الدِّیْنَ کا حکم آچکا ہے۔ اقامت دین کا فریضہ کیسے انجام پائے گا اگر مال خرچ نہیں کریں گے؟ یہی وجہ ہے قرآن مجید میں جہاں کہیں جہاد کا ذکر آیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ وہاں مال کا ذکر مقدم ہو گا۔ جیسے سورۂ حجرات میں سچے مومنین کے اوصاف بیان ہوئے :

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ ﴾

سورۂ صف میں فرمایا :

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ﴾

سورۂ توبہ میں فرمایا :

﴿ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ ﴾

جہاد میں مال خرچ ہوتا ہے' بلکہ دعوت و تبلیغ کے مرحلے پر تو مال ہی خرچ ہو گا۔ آگے چل کر اقامت دین کی جدوجہد میں وہ مرحلہ بھی آسکتا ہے کہ نقد جان ہتھیلی پر رکھو اور میدان میں آجاؤ۔ کفن سر سے باندھو اور باطل کے مقابلہ میں نکلو۔ اس مرحلہ کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جنگ اور اس کے نتیجے میں شہادت کی تمنا ہر دل میں لازماً ہونی چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مرحلہ آپ کی زندگی میں درپیش نہ ہو۔ اقامت دین کی جدوجہد آپ نے شروع کی ہے لیکن قتال بالسیف کا مرحلہ آپ کی زندگی میں نہیں آیا تو کوئی بات نہیں' مگر نیت و ارادہ اور تمنا و آرزو دل میں رہے۔ اللہ کی راہ میں جنگ اور شہادت کی تمنا سے جو سینہ خالی ہے اس کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا : ((فَقَدْ مَاتَ عَلٰی شُعْبَةٍ مِنَ النِّفَاقِ)) ایسے شخص کی موت ایک قسم کے نفاق پر آئی' وہ ایک نوع کے نفاق پر مرا۔ اللہ کے دین کے لئے مال خرچ کرنے کے لئے اصطلاح آتی ہے انفاق فی

سبیل اللہ۔ یہاں بھی یہی اصطلاح استعمال ہوئی۔ ﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ ﴾

ایک اور بات بھی اس مقام پر سمجھ لیجئے۔ رزق کا اطلاق بھی صرف مال یا ضروریات زندگی پر نہیں ہوتا بلکہ توانائیوں، صلاحیتوں اور قوتوں پر بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح "انفاق" بھی جامع اصطلاح ہے۔ اس کا اطلاق اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کے ساتھ اپنی توانائیاں، صلاحیتیں اور قوتیں صرف کرنے پر بھی ہوگا۔ اس آیت میں چار اوصاف بیان ہوئے : ﴿ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ ﴾ وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کی پکار پر لبیک کہا ﴿ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ﴾ اور اللہ سے اپنے تعلق کو قائم رکھنے کے لئے نماز کو قائم رکھا۔ ﴿ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ جماعتی زندگی کے اندر ہم خیالی اور باہمی اعتماد کی فضا برقرار رکھنے کے لئے باہمی مشورے کے نظام اور اس کی روح کو قائم کیا۔ ﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ اور جو کچھ بھی رزق اللہ نے انہیں دیا اس کو وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

بدلہ اور قصاص کے حکم و عبر اور عفو کا محل وقوع

عام طور پر عفو و درگزر اور معاف کرنا تو قابل مدح و تعریف بات سمجھی جاتی ہے مگر یہاں اسکے برعکس معاملہ ہے۔ فرمایا : ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴾ "اور وہ لوگ کہ جن پر جب زیادتی کی جائے تو وہ بدلہ لیتے ہیں"۔ معلوم ہوا کہ یہاں بالکل ہی رنگ بدل گیا۔ یہاں بدھ مت کے بھکشوؤں والا رنگ نہیں ہے، یہاں تو رنگ کچھ اور ہے۔ یہاں تو بطور وصف بتایا جا رہا ہے کہ وہ لوگ جن پر زیادتی ہو، وہ ایسے بے غیرت و بے حمیت نہیں ہیں اور نہ ہی ایسے نرم چارہ ہیں کہ جو چاہے ان کے ساتھ زیادتی اور ظلم کا معاملہ کر جائے اور وہ بیٹھے رہ جائیں۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جان لیجئے کہ ہمارے دین کا مزاج یہ ہے کہ وہ پورے نظام اجتماعی کو درست کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا دنیا میں جب بھی نظام عدل و قسط قائم ہوگا تو وہ کامیابی سے چل ہی نہیں سکتا جب تک کہ مجرموں، ظالموں، زیادتی کرنے والوں کو سزا نہ دی جائے۔ عدل و قسط کا تقاضا یہی ہے۔ عفو اور معافی کی بنیاد پر کوئی

اجتماعی نظام نہیں چل سکتا۔ عفو اور معافی کی بنیاد پر انسان کی اپنی ذاتی روحانیت میں ترفع ہو سکتا ہے' بلندی ہو سکتی ہے۔ ایک شخص انتقام اور بدلہ لینے پر قادر ہے لیکن پھر بھی وہ معاف کر دے تو یقیناً اس کی روحانی ترقی ہو گی۔ لیکن اجتماعی نظام اس اصول پر نہیں چلے گا۔ یہ دو چیزیں بظاہر متضاد ہیں' ان پر غور کیجئے۔ قرآن مجید ایک طرف انتہائی زور دیتا ہے کہ معاف کرو' درگزر کرو۔ ﴿ اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا ۝ ﴾ (النساء:۱۴۹) اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کئے جاؤ یا کم از کم برائی سے درگزر کرو (تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے چونکہ) اللہ بھی تو بڑا معاف کرنے والا ہے حالانکہ وہ (سزا دینے پر) قدرت رکھتا ہے۔ ایک مقام پر فرمایا : ﴿ وَاِنْ تَعْفُوْا وَ تَصْفَحُوْا وَ تَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ ﴾ (التغابن:۱۴) "اگر تم معاف کر دیا کرو' درگزر کر دیا کرو' اور بخش دیا کرو تو اللہ بھی غفور رحیم ہے"۔ اس سے زیادہ زوردار اپیل کوئی اور ہو سکتی ہے کہ تمہیں بھی احتیاج ہے کہ نہیں کہ تمہیں بھی اللہ معاف کرے؟ لہٰذا تم بھی اپنے بھائیوں کو معاف کرو' انسانوں سے درگزر کرو' اللہ تم سے درگزر کرے گا۔ اس سے زیادہ زوردار عفو کی ترغیب کا اور کوئی انداز نہیں ہو سکتا۔

اب سورۂ بقرہ کی یہ آیت ذہن میں لائیے : ﴿ وَلَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ ﴾ (آیت : ۱۷۹) (ہوشمندو تمہارے لئے زندگی قصاص میں ہے' بدلے میں ہے ـــــ دنیا کا نظام بگڑ جائے گا اگر عفو ہی عفو ہو۔ مجرموں کے حوصلے بڑھتے چلے جائیں گے۔ ایک مجرم کو معاف کر دیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ اگلے پر ہاتھ اٹھائے۔ لہٰذا اسے بدلہ ملنا چاہئے جو تورات کا قانون ہے' جسے قرآن مجید نے کھول دیا ہے :

﴿ وَكَتَبْنَا عَلَیْهِمْ فِیْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ ﴾

(المائدۃ:۴۵)

"اور ہم نے تورات میں یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان' آنکھ کے بدلے آنکھ' ناک کے بدلے ناک' کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لئے برابر کا بدلہ"۔

اس قانون پر عمل ہو تو مفسدوں اور شرپسندوں کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔

ایک کو سزا مل جائے گی تو ہزاروں کی آنکھیں کھل جائیں گی' ان کو عبرت حاصل ہو جائے گی۔ یہ ہے نظام کو درست کرنے کی ضرورت۔

چونکہ یہ سورہ اقامتِ دین کی سورہ ہے لہٰذا یہاں نظام کو صحیح و درست رکھنے کے اصول بتائے گئے ہیں۔ جہاں صرف دعوت و تبلیغ کی بات ہو گی وہاں بتایا جائے گا کہ معاف کرو' لوگ تمہیں گالیاں دیں تم انہیں دعائیں دو' لوگ تم پر پتھراؤ کریں تم ان کی خدمت میں پھول پیش کرو۔ ایک مرحلہ یہ بھی ہوتا ہے۔ اور ایک مرحلہ وہ ہے کہ نظام عدل و قسط قائم کرنے کے لئے باضابطہ میدان میں آ کر مقابلہ کرو۔ وہ نظام قائم ہو گا تو اس میں تعزیرات بھی ہیں' حدود بھی ہیں' سزائیں بھی ہیں' بدلے بھی ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بیعت خلافت کے بعد جو پہلا خطبہ دیا اس میں یہ الفاظ آتے ہیں : "لوگو! تم میں سے ہر قوی میرے نزدیک ضعیف ہو گا جب تک کہ اس سے حق وصول نہ کرلوں اور ہر ضعیف میرے نزدیک قوی رہے گا جب تک کہ اس کا حق نہ دلوا دوں"۔ اسلام کے نظام عدل و قسط میں قصاص اور بدلے کے قوانین کی اس قدر اہمیت ہے۔

غور کیجئے کہ یہ سورۂ مبارکہ مکی ہے اور مکی دور میں تو بدلے اور انتقام کی اجازت ہی نہیں تھی۔ پھر یہ مضمون یہاں کیوں آ رہا ہے؟ یہ مضمون یہاں اس لئے آ رہا ہے کہ پیش نظر یہ رہے کہ نظام یہی قائم کرنا ہے کہ بدلہ لینا ہے۔ اس وقت ہاتھ بندھے ہوئے ہیں بندھے رہیں' لیکن اندر ہی اندر لاوا کھولتا رہے کہ جب بھی ہاتھ کھول دیئے جائیں گے تو یہ جماعت میدان میں آ کر باطل کو للکارنے کے لئے تیار و مستعد ہو ـــــ اور اگر ان کو بنا ہی دیا جائے بدھ مت کے بھکشو' تو وہ میدان میں آنے کا حوصلہ کیسے کریں گے؟ پھر ان کا مزاج ان خطوط پر پرورش ہی کہاں پائے گا؟ یہاں تو ضرورت اس امر کی ہے کہ سینوں میں آگ سلگتی رہے ـــــ رکے ہوئے اس لئے ہیں کہ ابھی اس کی اجازت نہیں ہے۔ یہ ڈسپلن کی انتہا ہے کہ ماریں کھاؤ لیکن مدافعت میں بھی ہاتھ نہ اٹھاؤ ـــــ لیکن یہ نہ سمجھو کہ بدلہ ہے ہی نہیں' بدلہ ہے مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا ؎

ابھی نہ چھیڑ محبت کے راگ اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول سازگار نہیں!

اور علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی!

چنانچہ لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا حتیٰ کہ وہ وقت آیا جب ہاتھ کھول دیئے گئے :

﴿ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ﴾

"آج سے انہیں اجازت دی جا رہی ہے جن پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے' کہ وہ جنگ کریں (اور بدلہ لیں) اور بالیقین اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔

برائی کا بدلہ لینے کی اجازت

آگے چلئے' فرمایا : ﴿ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ ﴾ "اور برائی کا بدلہ تو برائی ہی ہے' ویسی ہی برائی"۔ وہی بات جو سورۂ مائدہ کی آیت ۴۵ میں ہے کہ آنکھ کے بدلے آنکھ' ناک کے بدلے ناک' کان کے بدلے کان' دانت کے بدلے دانت اور جیسا زخم لگایا گیا ویسا ہی زخم۔ یہ ہے قصاص کا قانون ﴿ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ ﴾ یہاں جو دوسرا سَیِّئَہ ہے وہ بیان کیلئے ہے' وہ برائی ہے ہی نہیں۔ بدلے میں اگر کسی کا دانت توڑا جائے تو یہ برائی نہیں ہے' لیکن چونکہ ظاہری مشابہت ہے' دونوں کاموں کی شکل ایک ہی ہے' کسی نے کسی کا دانت توڑا اس نے قصاص میں اس کا بھی دانت توڑ دیا' تو در حقیقت یہ سیئہ نہیں ہے۔ اس فعل کی ظاہری مشارکت کی وجہ سے لفظ سیئہ استعمال ہوا۔

عفو کی ترغیب

﴿ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ ؕ ﴾ ہاں جو (برائی کا بدلہ برائی سے لینے پر قادر ہونے کے باوجود) معاف کر دے اور اصلاح کی کوشش کرتا رہے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے"۔ انفرادی سطح پر واقعی یہ عمل روحانی ترفع کا ذریعہ بنتا ہے۔ آیت کے آخر میں فرمایا : ﴿ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۝ ﴾ "یقیناً اللہ تعالیٰ کو ظالم لوگ پسند نہیں ہیں" ـــــ برائی کا بدلہ لینے اور برائی کی سزا دینے کا ضابطہ اس کی شانِ عدل کا مظہر ہے۔

بدلہ لینے پر کوئی ملامت نہیں

اگلی آیت میں فرمایا :

﴿ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ ۝ ﴾

"اور جو کوئی اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیتا ہے اس پر ملامت کا کوئی راستہ نہیں ہے"۔

غور کیجئے یہاں رہبانیت اور بدھ مت کے بھکشوؤں کے تصور کو جڑ سے کاٹا جا رہا ہے۔ اگر کوئی بدلہ لے رہا ہے تو کوئی برائی نہیں ہے۔ اسے کسی قسم کی ملامت نہیں کی جا سکتی۔ کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ضرور معاف کر دے اور بدلہ نہ لے۔ نہیں! بدلہ اس کا حق ہے جس کے ساتھ برائی کی جائے۔ وہی بات جو sex کے بارے میں سورۂ مؤمنون اور سورۂ معارج میں کہی گئی تھی کہ جو لوگ اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر اندر رہتے ہوئے اپنی جنسی خواہش اور اس کے داعیہ کو جائز طریقہ سے پورا کریں تو ان کے لئے کوئی ملامت نہیں : ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○ ﴾ یہ جنس فی نفسہٖ کوئی شر نہیں ہے' یہ جذبہ اور یہ داعیہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں ودیعت کیا ہے' بقائے نسل اس کی غایت ہے۔ فی نفسہٖ یہ شر نہیں ہے۔ اگر جائز راستے سے انسان اس جذبہ کی تسکین کرتا ہے تو اس پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ یہ انداز اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ بعض مذاہب بالخصوص عیسائیت میں نکاح اور گھر گرہستی کو گھٹیا درجہ کا کام سمجھا جاتا ہے۔ وہی بات یہاں فرمائی گئی ہے کہ جس پر ظلم ہوا ہے وہ اگر بدلہ لے رہا ہے تو کسی ملامت کا کوئی مقام نہیں ہے : ﴿ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ○ ﴾

ملامت کے مستوجب ظالم ہیں

﴿ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ ﴾

"ہاں ملامت کے مستوجب اور مستحق تو وہ لوگ ہیں جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور جو زمین پر ناحق سرکشی کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے دردناک عذاب ہے"۔

صبر اور عفو کی تلقین

﴿ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ○ ﴾

"البتہ جو شخص صبر کرے (جھیلے' برداشت کرے' تحمل اختیار کرے) اور معاف کردے تو یہ نہایت باہمت کاموں میں سے ہے"۔

یہ پانچ آیات ۳۹ تا ۴۳ کس موضوع پر ہیں! بدلہ اور بدلہ کی اہمیت' اس کا مقام مدح میں ذکر کیا جانا اور اس کے خلاف جو تصورات و تخیلات ہیں ان کی مذمت۔ یہ نہ سمجھو کہ بدلہ لینے والا کوئی گھٹیا کام کرتا ہے' یہ اس کا حق ہے اس پر کوئی ملامت نہیں ہو گی۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص بدلے کی قدرت رکھتے ہوئے معاف کردے تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ اللہ اس کو بہتر بدلہ دے گا۔

ہوا کا رخ

یہ تمام باتیں اس سورۂ مبارکہ میں اس لئے بیان ہوئیں کہ ہوا کا رخ پہچان لیا جائے اور اچھی طرح سمجھ لیا جائے کہ توحید عملی کی یہ دعوت کس رخ پر آگے بڑھے گی۔ جو نظام قائم کرنا اس کا ہدف ہے' وہ کوئی راہبانہ نظام نہیں ہے بلکہ وہ پورا نظام مبنی بر عدل و قسط نظام ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا گیا: ﴿ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ﴾ "مجھے حکم ہوا ہے تمہارے مابین عدل کروں"۔ پھر وہ آیت: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ ﴾ "اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب بھی نازل کی اور میزان بھی نازل کی"۔ اس میزان عدل کو نصب کرو اور اس کی رو سے جو مستوجب سزا ہے اس کو سزا دو۔

ہدایت و ضلالت کا ضابطہ

﴿ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ ﴾

"اور جسے اللہ ہی گمراہ کردے پھر اس کے بعد اس کا کوئی دوست' ساتھی اور مددگار نہیں بن سکتا"۔

یہاں "اللہ ہی گمراہ کردے" کا کیا مطلب ہے! جس کی گمراہی پر اللہ کی طرف سے مہر ثبت ہو جائے۔ اللہ گمراہ نہیں کیا کرتا' انسان خود گمراہ ہوتا ہے۔ ہدایت بھی اللہ تعالیٰ زبردستی نہیں دیتا۔ ہدایت کے طالب کو اللہ ہدایت دیتا ہے۔ جو گمراہ ہے اور وہ اپنی ضلالت اور کجی کی وجہ سے ایک انتہا تک پہنچ گیا ہے تو وہاں جا کر اس کے دل پر اللہ بھی آخری مہر

تصدیق ثبت فرما دیتا ہے کہ اب یہ جدھر جاتا ہے جائے۔ ﴿ ...نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ ﴾ (النساء:۱۱۵) اب اس نے جو راستہ اختیار کیا ہم نے بھی اس کو اسی کے حوالے کیا' اب یہ Point of no Return کو پہنچ چکا ہے کہ اس کی واپسی کا کوئی امکان ہی نہیں۔ ﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ ﴾ (البقرۃ : ۷) یہ وہ لوگ ہیں جنہیں کوئی سیدھے راستے پر نہیں لا سکتا۔ اس میں حضور ﷺ کے لئے دلجوئی ہے کہ آپؐ پریشان نہ ہوں' غمگین نہ ہوں' آپؐ تشویش نہ رکھیں کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لا رہے۔ ان میں سے بہت سے وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہر لگ چکی ہے' لہٰذا اب وہ کسی صورت میں بھی پلٹنے والے نہیں۔

حسرت بھرا انجام

اسی آیت میں آگے فرمایا :

﴿ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ ﴾

"اور تم ان ظالموں کو دیکھو گے جب یہ عذاب دیکھیں گے (جہنم جب ان کے سامنے آجائے گی) تو یہ کہیں گے کہ ہے کوئی راستہ لوٹ جانے کا؟"

ہے کوئی شکل کہ ہم دُنیا میں پھر واپس پہنچ جائیں؟ کوئی اور چانس ملنے کی صورت ہے کہ نہیں! پھر ایسے لوگوں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے :

﴿ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ۭ ﴾

"اور تم دیکھو گے ان کو کہ جب وہ جہنم کے سامنے لائے جائیں گے تو ذلت کے مارے جھکے جا رہے ہوں گے اور اس کو نظر بچا کر کن انکھیوں سے دیکھیں گے"۔

ان پر ذلت مسلط ہو چکی ہو گی۔ ان کی نگاہیں زمین میں گڑی ہوں گی۔ ان کو اپنا انجام نظر آ رہا ہو گا کہ یہ ہے وہ جہنم جس میں ہم جھونکے جانے والے ہیں۔ جو ذلت و پشیمانی اور رسوائی ان پر تھپی ہوئی ہو گی اس کی وجہ سے ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی۔ مجرم ضمیر انسان آنکھ اٹھا کر اور آنکھ ملا کر کبھی نہیں دیکھتا' وہ آنکھوں کے کانوں سے دیکھتا ہے۔ لہٰذا

یہ ظالم جہنم کو نگاہ کے گوشے سے دیکھ رہے ہوں گے۔ ان میں اتنی جرأت نہیں ہو گی کہ نگاہ بھر کر دیکھ سکیں کہ اب یہ جہنم ہی ہمیشہ کے لئے ہمارا ملجا و ماویٰ ہے۔

اہل ایمان کی طرف سے اظہار تاسف

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ ﴾

"اور اہل ایمان کہیں گے (ان کے اس کہنے میں تاسف کا انداز ہو گا) کہ یہ لوگ ہیں اصل خسارے میں، جنہوں نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو قیامت کے دن خسارے میں مبتلا کیا"۔

یعنی دنیا میں تو ہمیں طعنے ملتے تھے کہ تمہاری مت ماری گئی ہے، تم دیوانے ہو، تم Fanatic ہو گئے ہو، تمہیں اپنے مستقبل کا کوئی خیال نہیں ہے، تمہیں اپنے نفع نقصان کی کوئی فکر نہیں ہے۔ یہ طعنے آج بھی ان لوگوں کو ملتے ہیں جو دین پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی یہ طعنہ ملتے تھے : ﴿ غَرَّ هٰٓؤُلَاۗءِ دِيْنُهُمْ ﴾ منافقین مدینہ مخلصین مؤمنین کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ ان کے دین نے ان کی مت ماردی ہے، ان کو دھوکے میں مبتلا کر دیا ہے، انہیں اپنے نفع نقصان کی فکر ہی نہیں، ان کا دماغ خراب ہوا ہے۔ یہ چلے ہیں قیصر روم کے ساتھ جنگ کرنے! ع بازی بازی باریش بابا ہم بازی!! ـــــ اب تک تو چلو عرب کے اندر ہی جنگ تھی۔ ایک کے مقابلے میں تین تھے۔ بدر میں یہی تناسب تھا۔ احد میں بھی ابتداء میں ایک اور تین کی نسبت تھی۔ بعد میں جب رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی اپنے آدمی لے کر واپس چلا گیا تو ایک اور چار کی نسبت رہ گئی۔ ابھی تو زیادہ سے زیادہ ایک اور دس کا تناسب رہا ہو گا، اس سے زیادہ تو نہیں۔ لیکن کہاں سلطنت روما! وقت کی عظیم ترین مملکت!! اسے حال ہی میں سلطنت کسریٰ کے خلاف بہت بڑی فتح حاصل ہوئی ہے اور ان کا morale بہت اونچا ہے۔ منافقین کہا کرتے تھے کہ ان کی تو عقلیں ماری گئی ہیں، انہیں کچھ نظر نہیں آرہا، یہ اپنے دینی جوش میں اندھے ہو گئے ہیں۔ ﴿ غَرَّ هٰٓؤُلَاۗءِ دِيْنُهُمْ ﴾ قیامت کے دن یہی مؤمنین کہیں گے کہ اصل میں اندھے ہم نہیں، یہ ہو گئے تھے۔ جیسے سورۂ ن میں فرمایا :

﴿ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ○ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ○ ﴾ "اے نبی! عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون دیوانہ ہو گیا تھا"۔ ﴿ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ○ ﴾ "اور تیرا رب خوب جانتا ہے کہ کون ہیں وہ لوگ جو اس کے راستے سے بھٹک گئے اور کون ہیں وہ جو ہدایت یافتہ ہیں"۔ آیت کے آخر میں فرمایا :

﴿ اَلَا اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ○ ﴾

"آگاہ ہو جاؤ یہ ظالم قائم و دائم اور رہنے والے عذاب میں رہیں گے"۔

اللہ کی پکڑ سے چھڑانے والا کوئی نہیں ہو گا

﴿ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾

"اور ان کے کوئی حامی مددگار نہ ہوں گے جو اللہ کے مقابلے میں ان کی مدد کر سکیں"۔

شفاعت باطلہ کے تمام خیالات و تصورات اُس روز ہوا ہو جائیں گے۔ اُس روز اللہ کی پکڑ سے کون چھڑانے والا ہے؟ کون بچانے والا ہے؟ کون اللہ کے فیصلے کے آڑے آنے والا ہے؟" آیت کے آخر میں فرمایا : ﴿ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ﴾ "جس کی گمراہی پر اللہ کی طرف سے مہر تصدیق ثبت ہو چکی ہو' اب اس کے لئے کوئی راستہ نہیں"۔

اللہ کی پکار پر لبیک کہنے کی ترغیب اور اعراض پر انذار

﴿ اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ○ ﴾

"مان لو اپنے رب کی بات قبل اس کے کہ وہ دن آئے اللہ کی طرف سے جس کے ٹلنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس دن تمہارے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہو گی اور نہ کوئی تمہارے حال کو بدلنے کی کوشش کرنے والا ہو گا"۔

﴿ اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ ﴾ اے سننے والو! اے قرآن کے پڑھنے والو! اے محمد (ﷺ) کے نام لیوا و! لبیک کہو اپنے رب کی پکار پر! آیت ۳۸ کے الفاظ یہ تھے : ﴿ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا

لِرَبِّهِمْ ﴾ وہاں تو اہل ایمان کی تعریف کے طور پر آیا تھا۔ یہاں ایک عمومی پکار ہے' ان کو بھی پکارا جا رہا ہے جو محمد ﷺ کے ساتھی ہیں۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ لیکن ان کے متعلق پہلے ہی بتایا گیا کہ ﴿ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ ﴾ انہوں نے اپنے رب کی پکار پر لبیک کہا۔ انہوں نے اپنی گردنیں کٹوا دیں۔ انہوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

لیکن اس آیت کا مخاطب میں اور آپ ہیں ﴿ اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ۝ ﴾ لبیک کہو اپنے رب کی پکار پر' مانو اپنے رب کے مطالبے کو' کمر کس لو اپنی اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے جو بایں الفاظ بیان ہو چکی : ﴿ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ ﴾ اس سے پہلے پہلے کہ اللہ کی طرف سے وہ دن آ دھمکے کہ پھر کوئی اس دن کو لوٹانے والا نہ ہو گا۔ اللہ کی طرف سے جب قیامت کی گھڑی آ جائے گی تو اس کو لوٹانے اور ٹالنے والا کوئی نہ ہو گا۔ یہاں جو "مِنَ اللّٰهِ" آیا ہے تو اس کا تعلق یوم سے ہے۔ اللہ کی طرف سے جب وہ دن آ دھمکے تو اس کو لوٹانے والا کوئی نہیں۔ قیامت کی گھڑی جب آئے گی وہ ٹالی نہ جائے گی۔ ایک چھوٹی قیامت بھی تو ہے جو ہر شخص کے سامنے ہے یعنی موت اور وہ تو بالکل قریب ہے

ع دُنیا سے قیامت دور سہی' دُنیا کی قیامت دور نہیں!

ایک تو بڑی قیامت آئے گی جس میں کائنات کا یہ سلسلہ تمام کا تمام درہم برہم ہو جائے گا اور ایک قیامت انفرادی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا : ((مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ)) "جو مر گیا اس کی قیامت تو قائم ہو گئی"۔ تو اپنے رب کی پکار پر لبیک کہو اس سے پہلے پہلے کہ یہ دُنیا کی قیامت آ جائے' جس کے متعلق سورۂ منافقون کے آخر میں فرمایا :

﴿ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾
"اور جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں

سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور اُس وقت وہ کہے کہ اے میرے رب کیوں نہ تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا ـــــ حالانکہ جب کسی کے لئے موت کا معین وقت آجائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے ہرگز مؤخر نہیں کرے گا"۔

یہاں فرمایا : ﴿ مَالَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ۝ ﴾ "اس دن تمہارے لئے نہ کوئی پناہ گاہ ہوگی اور نہ اس دن تمہاری طرف سے کوئی انکار کر سکے گا"۔ یا "نہ ہی تمہاری طرف سے کوئی پوچھ گچھ کرنے والا ہوگا"۔ نکیر کے یہ دونوں ترجمے کئے گئے ہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ اگر کبھی آپ کے کسی عزیز یا واقف کار کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہو تو آپ جا کر پوچھ گچھ کرتے ہیں کہ اس کو کیوں پکڑا ہے! اس کا کیا جرم ہے؟ اس نے کیا خطا کی ہے؟ لیکن وہاں روز قیامت کوئی نہیں ہوگا جو جا کر پوچھ گچھ کر سکے۔ اس دُنیا میں بعض ممالک کے بارے میں یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ وہاں اگر پولیس کسی کو پکڑ کر لے جائے تو وہاں کوئی پولیس کے پاس جا کر یہ پوچھنے کی جرأت نہیں کرتا کہ اس کو کیوں پکڑا ہے۔ اس لئے کہ جو پوچھنے جائے گا اسے بھی دھر لیا جائے گا۔ ایسا نظام بھی بالفعل دُنیا میں بعض اسلامی ممالک میں موجود ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ ایسا نظام صرف روس یا بعض کمیونسٹ ممالک میں ہے۔ تو یہاں "نکیر" یہ مفہوم بھی دے رہا ہے کہ کوئی پوچھ نہ سکے گا کہ اس کو پکڑا ہے تو کیوں پکڑا ہے۔ تو یہاں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اس سے پہلے پہلے کہ وہ دن آجائے کہ جس کا نہ لوٹانا ممکن ہو' نہ اس روز کسی کو کوئی جائے پناہ میسر آئے' نہ کوئی انکار کر سکے نہ ان کی طرف سے کوئی پوچھ گچھ کرنے والا ہو' اپنے رب کی پکار پر لبیک کہو اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ۔

اگلی آیت میں خطاب کا رخ ہو گیا حضور ﷺ کی طرف۔ بڑا پیارا انداز ہے۔ فرمایا : ﴿ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ ﴾ اے نبی (ﷺ) اگر یہ سب کچھ سن لینے کے بعد یہ لوگ اعراض کریں' سب کچھ پی جائیں' ٹس سے مس نہ ہوں تو آپ ملول نہ ہوں' غمگین نہ ہوں۔ ہم نے آپ کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا۔ یہ تو انسان کا اپنا فیصلہ ہے : ﴿ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴾ آپ کا کام ہے ہدایت کی راہ کھول دینا اور دکھا دینا۔ آپ کا کام ہے ذمہ داریوں کو بیان اور واضح کر دینا۔ آپ کا فرض منصبی ہے حق کو مبرہن کر دینا' واشگاف کر دینا۔ آپ کے ذمہ ہے ابلاغ اور تبلیغ کا حق ادا کرنا۔ یعنی

﴿ اِنْ عَلَیْکَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ ﴾ آپؐ نے یہ سب کچھ جب بیان کر دیا پھر بھی وہ اعراض کر رہے ہیں۔ آپؐ نے ہماری پکار لوگوں تک پہنچا دی۔ پکار تو اللہ کی ہے اسے حضور ﷺ اپنی زبان مبارک سے ادا فرما رہے ہیں' جیسا کہ اذان بظاہر تو مؤذن کی زبان سے نکل رہی ہے لیکن ہے تو وہ اللہ کی پکار ؎

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے کیا جانئے کس کی ہے یہ صدا
پیغام سکوں پہنچا بھی گئی دل محفل کا تڑپا بھی گئی!!

آواز کسی اور کی ہے لیکن پکار کسی اور کی ہے۔ تو اے محمد (ﷺ) یہ پکار ہماری ہے: ﴿ اِسْتَجِیْبُوْا لِرَبِّکُمْ ﴾ ادا آپ کی زبان سے ہو رہی ہے۔ ﴿ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰکَ عَلَیْھِمْ حَفِیْظًا ؕ اِنْ عَلَیْکَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ ﴾ یہ لوگ پھر بھی نہ مانیں' پیٹھ دکھائیں تو آپؐ قطعاً ملول نہ ہوں۔ آپؐ نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ سورۂ غاشیہ میں اسی بات کو اس اسلوب سے بیان کیا گیا ﴿ فَذَکِّرْ ۫ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ ۝ ﴾ "پس اے نبی آپ یاددہانی کراتے رہیے۔ آپ تو بس نصیحت ہی کرنے والے ہیں' ان پر داروغہ نہیں ہیں (کہ ان کو لازماً راہ راست پر لے آئیں گے)

اللہ کی پکار پر لبیک کہنے کے موانعات

اگلے الفاظ میں پھر ایک دوسرے دل نشیں اسلوب سے ان موانعات کا ذکر ہے جو انسان کو اللہ کی پکار پر لبیک کہنے سے روکتے ہیں۔ شاید کسی کے پاؤں میں پڑی ہوئی یہ بیڑیاں کھل جائیں' کسی کو شعور حاصل ہو جائے' کوئی خواب غفلت سے بیدار ہو جائے۔ فرمایا:

﴿ وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِھَا ۚ وَاِنْ تُصِبْھُمْ سَیِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْھِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ کَفُوْرٌ ۝ ﴾

"انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو اس پر پھول جاتا ہے۔ اور اگر اس کا اپنے ہاتھوں کا کیا دھرا کسی مصیبت کی شکل میں اس پر الٹ پڑتا ہے تو سخت ناشکرا بن جاتا ہے"۔

انسان بڑا تھڑدلا ہے' بہت کم ہمت ہے۔ جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں' مثلاً

آسائش ہے' دولت ہے' آرام ہے' ثروت ہے' دُنیا کی نعمتیں جمع ہو گئی تو اترانے لگتا ہے' اکڑنے لگتا ہے' پھولے نہیں سماتا۔ لیکن اور اگر کہیں کوئی تکلیف آ گئی' کوئی مصیبت آ گئی اور وہ آتی ہے ان کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے تو انسان بالکل ناشکرا ہو جاتا ہے۔ ہمت بھی ٹوٹ گئی' حوصلہ بھی ہار بیٹھتا۔ اعتدال کی روش اختیار نہیں کرتا۔ جو انسان طالب دُنیا ہوتے ہیں وہ نارمل نہیں رہتے۔ دُنیا مل گئی تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے' پاؤں زمین پر ٹک نہیں رہے' گردن اکڑی ہوئی ہے اور جب ذرا دُنیا چھن گئی' تنگی آ گئی تو بجھ کر رہ جاتا ہے' کوئی ہمت نہیں' کوئی ولولہ نہیں۔ خود کشیاں ہو جاتی ہیں۔ تو یہ انتہائیں دُنیا میں عموماً نظر آتی ہیں۔

پہلے فرمایا گیا تھا : ﴿ فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ﴾ "جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دُنیا کی چند روزہ زندگی کا برتنے کا سامان ہے"۔ یہاں اس سروسامان میں سے ایک خاص بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ دیکھو انسان کو اولاد بہت پیاری ہے۔ دولت پیاری اور اولاد پیاری۔ لیکن کیا اولاد کے ضمن میں کسی کے ہاتھ میں اختیار ہے؟ اللہ ہی کے ہاتھ میں اس کا فیصلہ ہے۔ فرمایا : ﴿ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ﴾ "آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے"۔ ﴿ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ ﴾ "وہ جو چاہتا ہے تخلیق فرماتا ہے"۔ آپ کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں۔ رحم مادر میں کیا چیز پروان چڑھ رہی ہے' آپ کو کچھ پتہ نہیں۔ یہاں بالکل اللہ ہی کا اختیار کارفرما ہوتا ہے : ﴿ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ الذُّكُوْرَ ۝ ﴾ "وہ جس کو چاہتا ہے بیٹیاں ہی بیٹیاں دیتے چلا جاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹوں سے نواز دیتا ہے"۔ وہ مطلقاً با اختیار ہے۔ اس سے پوچھنے والا کوئی نہیں۔ اگلی آیت میں فرمایا : ﴿ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ ﴾ "یا کسی کے لئے جوڑے جوڑے کر دیتا ہے"۔ بیٹے بھی اور بیٹیاں بھی ﴿ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَاۗءُ عَقِيْمًا ۭ ﴾ "اور جس کو چاہتا ہے بانجھ بنا کر رکھ دیتا ہے" کوئی اولاد نہیں' تڑپ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ مال اور اولاد یہ ہیں دُنیا کے سب سے بڑے فتنے : ﴿ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ﴾ یہ مال اور اولاد ہی تو تمہارے لئے سب سے بڑی آزمائش ہیں۔ کوئی ہے جو یہ کہہ سکے کہ اولاد میرے اختیار میں ہے' میری محنت سے اولاد ہو سکتی ہے؟ اللہ چاہے تو بانجھ بنا دے۔ لاکھ جتن کر لے کہ اولاد ہو جائے

لیکن نہیں ہو سکتی اگر اللہ نہ چاہے۔ اللہ چاہے تو بیٹیاں یا بیٹے دیتا چلا جائے۔ اللہ چاہے تو بیٹے بھی دے اور بیٹیاں بھی۔ ایک متوازن خاندان وجود میں آجائے۔ اسی بات میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ مال و دولت دنیوی بھی بالکلیہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اس میں تمہیں دھوکہ لاحق ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ جتنی محنت زیادہ کرو گے اتنا ہی زیادہ کما لو گے' جتنی بے ایمانی کرو گے اتنا ہی شاید تمہیں زیادہ مل جائے گا۔ یہ مغالطے اور دھوکے ہیں جو تم کو لگ گئے ہیں۔ یہ بھی اللہ کی طرف سے معین ہے۔ کوئی شخص اپنی مقررہ روزی میں اضافہ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا جب دُنیا کے تمام معاملات کا یہی مسئلہ ہے تو انسان کو یک سو ہو کر ان چیزوں کو اللہ کے حوالے کر کے اور انہیں صرف متاعِ دُنیا سمجھ کر اپنی توانائیوں' اپنی قوتوں' اپنی صلاحیتوں کا اکثر و بیشتر حصہ اقامت دین کی جدوجہد کے لئے کھپا دینا چاہئے۔ آیت کا اختتام ہوتا ہے اس پُر جلال اسلوب سے : ﴿ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ ﴾ "یقیناً وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قادر ہے"۔ سب کچھ جاننے والا' تمام قدرت رکھنے والا تو صرف وہی ذات اقدس و سبحانہ ہے۔ اسی پر تمہارا توکل' اعتماد اور تکیہ ہونا چاہئے۔

پیغام عمل

قرآنی آیات اور اسوۂ حسنہ کی روشنی میں توحید عملی اور توحید عملی کا اقامت دین سے ربط و تعلق واضح طور پر ہمارے سامنے آگیا۔ اب ہر شخص کا اپنا معاملہ ہے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور فرائض اس کے عائد کردہ۔ پہنچانے کی اوّلین ذمہ داری رسول اللہ ﷺ کی تھی' اب اللہ تعالیٰ جسے توفیق دے دے' وہ اس پیغام کو پہنچاتا چلا جائے۔ حضور ﷺ نے ہم کو حکم دیا ((بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً)) "پہنچاؤ میری جانب سے چاہے ایک ہی آیت"۔ اب عمل کرنا یا نہ کرنا اس کی ذمہ داری آپ پر ہے' کمر ہمت کسنا نہ کسنا اس کا فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ پھر یہ کہ عمل کا ارادہ ہو تو اقامت دین کی جدوجہد اور اپنی دیگر دینی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے کس قافلے کے ساتھ جڑیں۔ کوئی قافلہ موجود ہے کہ نہیں ہے۔ کوئی نیا بنائیں تو کس طرح بنائیں۔ یہ عملی مسائل ہیں۔ یہ ہر شخص کے اپنے سوچنے کی بات ہے۔ میں نے قرآن مجید اور سیرت مطہرہ کے معروضی مطالعہ سے اپنی امکانی حد تک اور اپنی استعداد کے مطابق جو کچھ سمجھا ہے' مَیں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ

اس نے مجھے اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق بھی عطا فرمائی اور ہمت بھی۔ اس کام کو اجتماعی طور پر انجام دینے کے لئے میں نے "تنظیم اسلامی" کے نام سے ایک جماعت قائم کی ہوئی ہے۔ باقی یہ کہ ہر شخص کو اپنی قبر میں جانا ہے اور اللہ کی عدالت میں اپنے معاملہ کا خود ہی مواجہ (Face) کرنا ہے۔ ﴿ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴾ (مریم : ۹۵) ہر شخص کو فرد کی حیثیت سے اللہ کی عدالت میں پیش ہونا ہو گا اور جواب دہی کرنی ہو گی۔ میں آپ کی طرف سے جواب دہی نہیں کروں گا اور نہ آپ میری طرف سے جواب دہی کریں گے۔ میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں' اس پر چل رہا ہوں۔ جو چیزیں ہماری مشترک ہیں انہیں پیش کر رہا ہوں۔ یہ قرآن میرا نہیں ہے یہ ہم سب کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ یہ ہدایت صرف میرے لئے نہیں ہے ہم سب کے لئے ہے۔ قرآن کا پیغام' توحید کے تقاضے میں نے آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ اب سوچنا' عمل کی راہ تلاش کرنا اور اپنے دینی فرائض کی ادائیگی کی فکر کرنا ہر شخص کی اپنی ذمہ داری ہے۔

بارک اللّٰہ لی ولکم فی القرآن العظیم
ونفعنی وایاکم بالایات والذکر الحکیم

"خطباتِ خلافت"

امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان

ڈاکٹر اسرار احمد کے چار خطبات کا مجموعہ

سفید کاغذ' عمدہ طباعت' صفحات 212

قیمت : (اشاعت خاص مجلد) 80 روپے اشاعت عام : 45 روپے

اس کتاب کا مطالعہ خود بھی کیجئے اور اسے زیادہ سے زیادہ عام کیجئے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور (فون : 03-5869501)

اللہ قرض سے بچائے

—— تحریر : محمد عالم ندوی ——

زمانے کے ساتھ اس کی قدریں بھی بدل جاتی ہیں۔ پہلے زمانے میں لوگ اپنی گاڑھی کمائی سے کچھ پیسہ بچا کر اس لئے رکھتے تھے کہ وہ وقت ضرورت کام آئے۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں ضرورتیں آمدنی سے بڑھ گئی ہیں اور چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے والے عقل مند کی حد درجہ کمی ہو گئی ہے۔ "چادر ہے تھوڑی پیر پسارے بہت" جیسے مقولے پر بڑی سنجیدگی سے عمل کیا جارہا ہے۔ مستقبل میں آنے والی مصیبتوں اور ضرورتوں کو مد نظر رکھ کر حالیہ آمدنی میں سے کچھ بچالینا کوئی عیب تو نہیں ہے مگر حال کی خواہشات بے جا پر ضرورت کا غلاف ڈال کر مستقبل کو قرض کے ماتمی لباس میں پیش کرنا یقیناً بادل دیکھ کر گھڑے پھوڑنے والی بات ہے۔ پہلے لوگ بدرجہ مجبوری قرض لیا کرتے تھے' آج قرض لینا شوق میں داخل ہو گیا ہے۔ قرض مل جانے پر سینہ غبارے کی طرح خوشی سے پھول جاتا ہے' مگر جب دینے کی باری آتی ہے تو دن بہ دن بتاشے کی طرح بیٹھتے چلے جاتے ہیں۔ لوگوں کی دیکھا دیکھی وہ لوگ بھی تمناؤں کی کشتی میں سوار ہو کر قرض کے بھنور میں چکر کاٹ رہے ہیں جن کی زندگیاں بڑے مزے سے گزر رہی تھیں۔ اسی دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو قرض ادا ہو جانے پر راحت کی سانس لیتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو قرض ملنے کو ترقی کا خواب دیکھتے ہیں۔ قرض مجبوری میں حالیہ ضرورت کے تحت لیا جاتا ہے نہ کہ برسوں بعد پیش آنے والی مفروضہ ضرورتوں کے لئے قرض کی زنجیر پاؤں میں ڈالی جاتی ہے۔ اس طریقہ کار سے انسان کبھی خوش نہیں رہ پاتا۔

اس ترقی یافتہ دور میں سرکاری اور نجی بینکوں اور کمپنیوں کی جانب سے لوگوں کو قرض لینے پر آمادہ کیا جارہا ہے۔ کسی ایک فرد کی بات نہیں ہے' اب تو ترقی پذیر حکومتیں بھی عالمی بینکوں سے قرض لے کر اپنے ملکی مسائل حل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ بڑی بڑی کمپنیوں اور کارخانوں کے مالکان کے کاندھے بھی قرض کے بوجھ سے خالی نہیں ہیں۔

گھر کے معمولی معمولی سامان سے لے کر موٹر گاڑیوں تک کے لئے قرض کی سہولتیں فراہم ہیں۔ جو بنگلے اور عالی شان عمارتیں قرض کے ستونوں پر کھڑی لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر رہی ہیں اگر ان کے مکینوں کی ظاہری شان و شوکت کی حقیقت معلوم ہو جائے تو ہر باضمیر اور غیرت مند شخص ایسے امیر بننے سے ہزار بار توبہ کر کے اپنے جھونپڑے میں عزت کے ساتھ زندگی گزارنا زیادہ پسند کرے۔ سچ پوچھئے تو بہت سی بڑی کوٹھیوں اور محلات کے مقروض عیش پسند اور ناعاقبت اندیش مالکوں کی اندرونی حالت یہ ہے کہ "خوان بڑا خوان پوش بڑا' کھول کے دیکھو تو آدھا بڑا"۔

قرض سے خوشحالی نہیں' بدحالی آتی ہے۔ نیک سیرت انسان کے اندر بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے تو آنحضرت ﷺ نے قرض کے معاملہ میں اللہ سے پناہ مانگی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز میں دعا مانگتے تھے : "یا اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں گناہ سے اور قرض داری سے"۔ ایک شخص نے پوچھا : یا رسول اللہ اس کی کیا وجہ ہے جو آپ قرض داری سے پناہ مانگتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "آدمی جب قرض دار ہوتا ہے تو جب بات کرے تو جھوٹ کہتا ہے اور وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے۔" (بخاری)

قرض لینے کے بعد آدمی بہت سی انجانی پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ غیر ضروری چیزوں میں پیسہ زیادہ سے زیادہ خرچ ہوتا ہے اور جس مقصد کے تحت قرض لیا تھا اگر اس میں ناکامی ہو گئی تو سمجھ لیجئے وہ زندہ درگور ہو گیا۔ اس کے برعکس وہ شخص جس نے اپنی حالیہ ضرورتوں کو کم کر کے مستقبل کیلئے کچھ بچا رکھا ہے' اگر اس نے کسی تجارت میں اپنا پیسہ لگایا اور (خدانخواستہ) وہ پیسہ ڈوب گیا تو چونکہ اس کا اپنا پیسہ ڈوبا ہے اسلئے اسے کوئی خاص پریشانی نہ ہو گی لیکن جس نے قرض لے کر کوئی تجارت کرنے کا ارادہ کیا یا مستقبل میں مزید آرام کے لئے مکان وغیرہ خریدنے کی کوشش کی اور اپنے مقصد میں وہ ناکام ہو گیا تو ایک تو پیسہ ڈوبنے کا غم دوسرے اس قرض والے پیسے کو لوٹانے کی فکر اسے زندہ دفن کر دیتی ہے۔ ایسی صورت میں جس سے قرض لیا ہے اس سے آنکھیں چراتا پھرتا ہے' وقت بے وقت جھوٹے بہانے بناتا ہے' وعدہ کر کے وعدہ خلافی کرتا ہے۔ یہ ساری برائیاں اس کے اندر اس لئے آئیں کہ اس نے اپنی موجودہ حالت پر اللہ کا شکر ادا نہیں کیا۔ اسے

آپ ﷺ کا یہ فرمان یاد نہیں رہا جس کا مفہوم یہ ہے کہ "دنیا کے معاملے میں ہمیشہ اپنے سے نیچے درجے والوں کو دیکھو"۔ اگر انسان اپنے سے نیچے درجے والوں کو دیکھے تو اللہ کا شکر ادا کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کتنوں سے بہتر زندگی عطا فرمائی ہے۔ افسوس کہ لوگ ہمیشہ اپنے سے اوپر والوں کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ اپنے پروردگار کی ناشکری جیسے گناہ میں ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ سماج میں عزت پاتے ہیں اور نہ ہی مذہب میں انہیں کوئی بلند مقام حاصل ہو پاتا ہے۔ بقول شاعر ؏

خدا ہی ملا نہ وصال صنم
اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے!

اسلام کے ابتدائی زمانے میں جب مسلمانوں کے پاس پیسوں کی کمی تھی اس وقت اگر کوئی مسلمان قرض دار ہو کر مرجاتا تو نبی اکرم ﷺ اس کے جنازے کی نماز نہ پڑھتے تھے بلکہ صحابہؓ سے کہہ دیتے کہ تم پڑھ لو۔ اللہ تعالیٰ نے جب مسلمانوں کو فتوحات دیں اور ان کی وجہ سے مسلمانوں کے پاس مال بھی زیادہ سے زیادہ آیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اب اگر کوئی مسلمان قرض دار ہو کر مرتا ہے تو اس کے قرض کو میں ادا کروں گا اور اس کے بے سہارا بچوں کی پرورش بھی ہمارے ذمہ ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب کوئی مومن رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مرتا تو آپؐ پوچھتے کیا اس نے اتنا مال چھوڑا ہے کہ اس کا قرض ادا ہو جائے۔ اگر لوگ کہتے کہ "ہاں" چھوڑا ہے تو آپؐ اس کی نماز جنازہ پڑھتے اور اگر جواب "نہیں" میں آتا تو فرماتے "تم اپنے ساتھی پر نماز پڑھ لو"۔ پھر جب اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو فتح دی تو آپؐ نے فرمایا "میں مومنوں کے زیادہ قریب ہوں ان کی جانوں سے، تو جو کوئی فوت ہو جائے اور قرض دار ہو تو میں اس کا قرض ادا کروں گا اور جو کوئی مال چھوڑ جائے تو وہ اس کے وارث لیں گے"۔ (ابن ماجہ)

غور کیجئے کہ آپ ﷺ ابتدائی زمانے میں قرض داروں کی نماز جنازہ بھی نہ پڑھتے تھے۔ بال بچے اگر بھوکے مر رہے ہوں، رہنے کے لئے گھر نہ ہو، دوا علاج کے پیسے نہ ہوں تو کسی بھی شخص کو قرض لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن دوسروں کو ستانے کے لئے یا

مزید جائیداد بنانے کے لئے اگر قرض لیا جائے تو اس قرض کا وبال قرض لینے والے کے سر پر ہو گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جو شخص لوگوں کا مال اس نیت سے لے کہ اس کو ادا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادا کر دے گا اور جو اس کو تباہ کرنا چاہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو تباہ کر دے گا"۔ (بخاری)

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص کچھ قرض لے اور اس کی نیت یہ ہو کہ اس کو ادا نہ کرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ سے چور ہونے کی حیثیت میں ملے گا"۔ (ابن ماجہ)

مذکورہ بالا احادیث کی روشنی میں مسلمانوں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے کہ وہ قرض کس ضرورت کے لئے لے رہے ہیں؟ لوگوں کا مال ہڑپ کرنے کے لئے، عیش و عشرت کے لئے یا واقعی اپنے بال بچوں کی ضرورت کے لئے؟ پہلی دو صورتوں میں قرض لینا یقیناً باعث گناہ ہے لیکن زندگی کی اہم ضرورت کے پیش نظر قرض لینے کی اجازت ہے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت کے دن قرض دار سے قرض کا بدلہ لیا جائے گا۔ (یعنی اس کی نیکیاں قرض کے بدلے قرض خواہ کو دی جائیں گی) جب وہ مرجائے، اِلّا یہ کہ کوئی شخص تین باتوں میں قرض دار ہو۔ ایک تو وہ شخص جو اللہ کی راہ میں جہاد کر رہا ہو، لیکن کمزور ہو جائے پھر قرض لے کر اپنی طاقت کو بڑھائے اور اس کی نیت یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے دشمن کے مقابل اس کو قوت حاصل ہو۔ دوسرے وہ شخص جس کے پاس ایک مسلمان مرجاوے اور اس کے کفن دفن کے لئے کچھ نہ ہو تو وہ قرض لے لے۔ تیسرے وہ غیر شادی شدہ جو اس بات سے خوفزدہ ہو کہ اس کے دین پر آفت نہ آئے (یعنی کہیں وہ زنا میں مبتلا نہ ہو جائے اور وہ نکاح کرنے کے لئے قرض لے) تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا قرض قیامت کے دن ادا کر دے گا۔ (ابن ماجہ)

اللہ تعالیٰ ایسے ضرورت مند اور دین میں مخلص لوگوں کا قرض کس طرح ادا کرے گا وہ تو وہی جانے، مگر مسلمانوں کو جہاں تک ممکن ہو اپنے آپ کو قرض دار ہونے سے بہرحال بچانا چاہئے۔

(بشکریہ مجلّہ "البلاغ")

بیعت ـــــ ایک اشکال اور اس کا جواب

مکرمی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ندائے خلافت مورخہ ۸ نومبر کے شمارے میں آپ کی آنکھ کے آپریشن کا اعلان نظر سے گزرا۔ امید ہے کہ آپریشن کامیاب رہا ہو گا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ صحت عاجلہ و کاملہ عطا فرمائے۔ آمین!

میثاق اکتوبر کے شمارے میں صفحہ ۱۱' دوسری سطر میں آپ نے یہ جملہ نقل کیا ہے "الانسان مرکب من الخطاء و النسیان" اس کو آپ نے حدیث نبویؐ قرار دیا ہے لیکن کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ حدیث کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ جب کوئی حدیث بیان کی جائے تو اس کا مکمل حوالہ تحریر کیا جائے' اس لئے کہ کسی حدیث کا آنحضور ﷺ کی طرف منسوب کرنا بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ راقم الحروف نے متعدد کتابوں کا مطالعہ کیا لیکن کسی میں بھی اس عبارت کا تذکرہ نہیں ملا۔ دوسرے الفاظ میں ایک حدیث ملتی ہے یعنی: "رفع عن امتی الخطا و النسیان و ما استکرھوا علیہ"۔ یہ روایت انتہائی ضعیف ہے بلکہ موضوع ہے اور قرآن کے بھی خلاف ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "المقاصد الحسنۃ" للسخاوی ص ۲۲۸ حدیث ۵۲۸۔

آپ نے ندائے خلافت شمارہ ۱۹ تا ۲۵ اکتوبر میں دو حالتیں لکھی ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ تیسری حالت بھی ہو سکتی ہے کہ امامت کے مدعی ایک سے زیادہ ہوں اور کوئی بھی اقتدار کا حامل نہ ہو تو ایسی صورت میں آنحضور ﷺ نے حکم دیا ہے "فاعتزل تلک الفرق کلھا" مشکوٰۃ المصابیح' کتاب الفتن' حدیث ۵۳۸۲۔ نیز اس کی ہم معنی کئی حدیثیں ہیں' ملاحظہ ہو حدیث ۵۳۸۶ بحوالہ صحیح بخاری اور حدیث ۵۳۸۵۔ ان احادیث کے علاوہ اور بھی کئی روایتیں ہیں' مثلاً ملاحظہ ہو حدیث ۵۳۹۶' ۵۴۰۲' ۵۴۰۳ اور حدیث : ۵۴۰۶ بحوالہ الفصل الثانی' باب الملاحم' کتاب الفتن' مشکوٰۃ المصابیح' طبع

المکتب الاسلامی دمشق۔ مشکوٰۃ میں احادیث مذکورہ بالا حوالہ کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ "سمع وطاعت" پر بیعت اس شخص سے ہو سکتی ہے جو صاحب اختیار واقتدار ہو۔ مثلاً "سلطان" کا لفظ ایک روایت میں ہے۔

ا) مشکوٰۃ: کتاب الامارۃ والقضاء' الامام جنۃ یتقی من ورائہ' ح:۳۶۶۱' ۳۷۱۲

ب) مشکوٰۃ: کتاب الامارۃ' ح۳۷۰۵

ج) مشکوٰۃ: کتاب الامارۃ' ح۳۷۰۱

د) مشکوٰۃ: کتاب الامارۃ' ح۳۶۷۹و۳۶۷۶' و۳۶۷۷' و۳۶۷۸' و۳۶۹۵

والسلام

عبدالغفار حسن

۱۴۲۱/۹/۱ھ

سابق استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

سابق رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

☆ ☆ ☆

جواب

مخدومی مولانا دام ظلکم' السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

امید ہے کہ آپ بفضلہ تعالیٰ بخیر وعافیت ہوں گے۔

آپ کا ۱۴/ نومبر ۲۰۰۰ء کا املا کردہ خط اس وقت پیش نظر ہے۔ میں ۱۶/ نومبر کو ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ چنانچہ پہلے عمرہ سے مشرف ہوا اور پھر ماہِ رمضان مبارک امریکہ میں بسر کیا۔ واپسی پر جو ڈاک مجھے دی گئی اس میں سے کسی وجہ سے آپ کا خط رہ گیا ـــــ اب تین چار روز قبل میرے معاون سردار اعوان صاحب کو کاغذات میں آپ کا یہ خط نظر آیا ـــــ تو یہ میرے مطالعہ میں آیا۔

یہ اندازہ کر کے خوشی ہوئی کہ آپ پیرانہ سالی اور ضعیفی' اور متعدد عوارض کے باوجود ہمارے جرائد پر نظر ڈالتے رہتے ہیں ـــــ اور غلطیوں کی نشان دہی بھی فرماتے رہتے ہیں ـــــ میں نے حوالے کے لئے اکتوبر ۲۰۰۰ء کا پرچہ نکالا تو معلوم ہوا کہ واقعی

مرتب کرنے والے نے غلطی کی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے تقریر میں کہا تھا کہ "مجھے معلوم نہیں کہ یہ حدیث ہے یا کوئی حکیمانہ مقولہ" ـــــ بہرحال آپ کے توجہ دلانے کا شکریہ!

اسی طرح آپ نے میری بیان کردہ دو حالتوں پر مستزاد جس تیسری ممکنہ حالت کا ذکر فرمایا ہے وہ بھی صد فی صد درست ہے ـــــ چنانچہ یہ حسن اتفاق ہی ہے کہ ندائے خلافت کے تازہ شمارے (بابت ۲۲ تا ۲۸ فروری/۲۰۰۱ء) میں "اسلامی نظم جماعت میں بیعت کی اہمیت" کے عنوان سے میری جو کوئی پرانی تحریر (یا تقریر) شائع ہوئی ہے اس میں صفحہ ۶ پر اِس تیسری حالت کا ذکر موجود ہے ـــــ! تاہم آپ کے اس ضمن میں بھی توجہ دلانے کا شکریہ!

ویسے گزارش ہے کہ نارمل حالات میں تو واقعتاً وہی دو صورتیں ممکن ہیں جو میں نے عرض کی تھیں، البتہ "فتنہ" کی کیفیت میں یعنی جبکہ اسلامی حکومت یا نظامِ خلافت کے قیام کے بعد اس میں کسی سبب سے خلل واقع ہو جائے اور خلافت کے ایک سے زائد مدعی سامنے آجائیں تو اس صورت میں بھی ظاہر ہے کہ اوّل تو ہر شخص اس کا ساتھ دے گا جسے وہ برحق سمجھے گا ـــــ لیکن اگر کوئی شخص یہ فیصلہ نہ کر سکے تو پھر واقعتاً وہی صورت ممکن رہے گی کہ دروازہ بند کر کے گھر میں بیٹھ رہے ـــــ اور کسی کا بھی ساتھ نہ دے!

رہی یہ بات کہ "بیعت" صرف صاحب اختیار و اقتدار سے کی جا سکتی ہے تو اس قاعدہ کلیہ کی رو سے قرونِ اولیٰ میں حضرت حسینؓ کی بیعت، پھر حضرت نفس زکیہؒ کی بیعت، یا تیرھویں صدی ہجری میں سید احمد شہیدؒ کی بیعت یا مہدی سوڈانی، سنوسی، امیر عبدالقادر جزائری وغیرہم کی بیعت کے بارے میں کیا حکم ہو گا؟

جملہ اہل خانہ و متعلقین کی خدمت میں سلام مسنون، فقط والسلام مع الاکرام

طالب دعا

اسرار احمد عفی عنہ

نصابی کتب میں اہل سُنّت کی دلآزاری کیوں؟؟

چیئرمین پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے نام ایک خط

مکرمی جناب میجر (ریٹائرڈ) اقبال احمد صاحب!

چیئرمین پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ

السلام علیکم!

امید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔

میں یہاں دوحہ (قطر) میں ایک پاکستانی ہائر سیکنڈری سکول میں پڑھاتا ہوں اور آپ سے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی اضافی کتب کے بارے میں چند گزارشات کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ عرض کرنے سے پہلے چاہتا ہوں کہ اپنی پوزیشن کچھ واضح کر دوں کہ مبادا میری گزارشات کو مذہبی شدت پسندی نہ تصور کیا جائے۔ میں بنیادی طور پر نفسیات کا استاد ہوں اور اسی مضمون کی روشنی ہی میں یہ معروضات پیش کر رہا ہوں۔ نفسیات کے علاوہ دیگر مضامین بھی پڑھاتا ہوں اور خاص طور پر اسلامیات۔ مسلکی طور پر صرف اور صرف سنی مسلمان ہوں۔ اس کے علاوہ کسی اور مسلکی تقسیم میں منقسم ہوں اور نہ اسے صحیح سمجھتا ہوں اور نہ ہی اپنے مذہبی خیالات کے علاوہ خیالات رکھنے والے لوگوں کے بارے میں کسی بھی قسم کے تعصب کا شکار ہوں اور نہ اسے پسند کرتا ہوں۔ البتہ صرف اور صرف اتنا ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ ہر اکثریتی گروہ کو اس بات کا حق ہونا چاہئے کہ درسی و نصابی کتب میں اکثر و بیشتر انہی کے عقائد کو پیش کیا جائے، مگر اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ اس سے اقلیتی گروہ کی دل آزاری نہ ہو۔ یہی اصول دنیا بھر میں بطور اصل الاصول تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہر نظام میں Principal Law یا Major Law تو ہمیشہ اکثریتی گروہ یا اکثریت کے خیالات اور خواہشات کے مطابق ہوتا ہے مگر Personal Law میں اقلیتی گروہ کو آزادی ہوتی ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ مملکت خداداد میں صرف دو ہی مسالک آباد ہیں، ایک سنی مسلمان دوسرے شیعہ مسلمان، اور دونوں کے افکار و آراء سے ہم اکثر واقف ہیں۔ ہر

صاحب عدل و انصاف یہ تسلیم کرتا ہے کہ پاکستان میں سُنّی مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۸۰ سے ۹۰ فیصد ہے مگر اپنے ملک میں رائج نصابی کتب دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ معاملہ شاید اس کے برعکس ہے کہ ہر جگہ اسی اقلیتی گروہ کے نظامِ عقائد کو مدنظر رکھ کر نصاب کا اسلامی حصہ خاص طور پر قرنِ اوّل کی مسلم شخصیات یعنی صحابہ و صحابیات رضی اللہ عنہم کا حصہ مرتب کیا جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے اور نکل رہا ہے کہ ہمارے بچے یعنی اکثریتی گروہ کے بچے اپنے ہی عقائد و مسلمات سے نہ صرف ناواقف رہ جاتے ہیں بلکہ اقلیتی گروہ کی آراء کو اپنا بھی رہے ہیں۔

مثال کے طور پر ہم سب واقف ہیں کہ امت مسلمہ کی اکثریت کا اجماع ہے کہ "علیہ السلام" صرف اور صرف پیغمبروں کیلئے آتا ہے جبکہ اہل تشیع اپنے بارہ ائمہ کے ساتھ بھی یہی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مگر دو چار سال قبل کی تو اکثر نصابی کتب میں حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت فاطمہؓ کے نام کے ساتھ باقاعدہ علیہ السلام لکھا ہوتا تھا اور کچھ میں ابھی بھی لکھا ہوا ہے۔ مثلاً :

① تیسری جماعت کی اردو کی کتاب اشاعت مارچ ۱۹۹۹ء کے صفحہ ۱۰۵ پر موجود مضمون بعنوان "حضرت علی علیہ السلام" موجود ہے اور اس سارے مضمون میں حضرت علیؓ کے ساتھ علیہ السلام استعمال کیا گیا ہے۔ جبکہ اسی کتاب کے مضامین بعنوان حضرت خدیجہؓ صفحہ ۴۱، حضرت عمر فاروقؓ صفحہ ۸۹ سب میں رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ جبکہ اسی کتاب کے صفحہ ۸۰ پر ایک مضمون حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ہے۔ یعنی صرف دو حضرات حضرت ابراہیم اور حضرت علی کے ساتھ علیہ السلام کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

② جماعت پنجم کی معاشرتی علوم کی کتاب اشاعت اپریل ۱۹۹۹ء میں صفحہ ۱۱۵ پر مضمون حضرت "فاطمۃ الزہراء علیہا السلام" کے نام سے موجود ہے اور سارے مضمون میں آپ کیلئے علیہا السلام کے الفاظ ہی استعمال کئے گئے ہیں۔

عرض یہ ہے کہ خواہ علیہ السلام کے الفاظ جان بوجھ کر استعمال کئے گئے ہوں یا سہواً دونوں کے نتائج یکساں ہیں کہ ہم اپنی نئی نسل کو اس بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے کہ باقی صحابہ اور ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کیا فرق و امتیاز ہے کہ ان کے نام کے ساتھ استعمال ہونے والے القابات مختلف ہیں، اور دوم یہ کہ نہ ہی یہ وضاحت ہمارے لئے ممکن ہے کہ

حضرت علیؓ، حضرات حسنینؓ اور حضرت فاطمہؓ اور دیگر پیغمبرانِ خدا میں کیا قدرِ مشترک اور مماثلت ہے کہ جس کی بنا پر ان کے ناموں کے ساتھ استعمال ہونے والے القابات مماثل اور ایک ہیں۔ اگر ہم ان سوالات و اشکالات کے شافی جواب دینے کی کوئی سعی لاحاصل کر بھی لیں تو اکثر طلباء عام اصول کے تحت وہی کچھ قبول کریں گے اور وہی کچھ تسلیم کریں گے جو درسی کتب میں ان کو پڑھنے کو ملتا ہے اور اس کا نتیجہ سوائے اس بات کے اور کیا نکلے گا کہ اکثریتی گروہ کے اندر احساسِ محرومی، اقلیتی گروہ کے متعلق نفرت، ان کی مذہبی شناخت اور عقائد کو ختم کرنے کا لازمی تاثر اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا غصہ اور تعصب جنم لے گا اور اس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ منافرت اور مناقشت کو مزید ہوا ملے گی۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ تقریباً اکثر جماعتوں کے نصاب میں اُم المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر ایک سبق موجود ہوتا ہے۔ اور بعض میں تو مثلاً چھٹی جماعت کی اردو کی کتاب میں آپؓ کے بارے میں بڑی عمدہ اور وقیع تفصیلات اور معلومات موجود ہیں۔ مثلاً حضرت خدیجہؓ کے نکاح خواں حضرت ابو طالب کا تذکرہ اور حضرت خدیجہؓ کے وکیل نکاح کا تذکرہ وغیرہ، مگر اس پورے مضمون میں اور اسی طرح آپؓ کی ذات پر میٹرک تک کی ساری نصابی کتب میں شامل مضامین میں کسی ایک میں بھی آپؓ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کا سرے سے کوئی تذکرہ تک نہیں ہے۔

اسی طرح ان نصابی کتب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر (معاشرتی علوم جماعت چہارم صفحہ ۱۱۵) سبط الرسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر (اردو جماعت ہشتم و اردو جماعت نہم و دہم) اور نواسیٔ رسولِ خدا حضرت زینب رضی اللہ عنہا پر (اردو جماعت ہشتم) تو مضامین داخل نصاب ہیں، اور یقیناً ہونے بھی چاہئیں کہ یہ سبھی آسمانِ ہدایت کے روشن ستارے ہیں، مگر پورے درسی نصاب حتیٰ کہ جماعت اول سے لے کر ایف۔ اے تک کسی بھی کتاب میں ایک لفظ اور ایک فقرہ بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی باقی تین بنات الطاہرات (بیٹیوں) پر ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ طلباء کیا اچھے اچھے پڑھے لکھوں کو بھی یہی معلوم ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک ہی بیٹی حضرت فاطمہؓ تھیں۔

اسی طرح اسلامیات اختیاری جماعت نہم و دہم اشاعت ۱۹۹۸ء میں اخلاق نبویؐ کے ضمن میں صفحہ ۲۰۷ پر حضرت ابو سفیانؓ کی قبل اسلام مخالفت اسلام، فتح مکہ کے موقع پر ان کی گرفتاری اور پھر اسی موقع پر نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ان کے گھر کو دار الامان قرار دینے کی ساری باتیں موجود ہیں۔ اگر موجود نہیں تو اسی موقع پر ابو سفیانؓ کے اسلام لانے کی بات، حالانکہ ان کے گھر کو دار الامان قرار دینا ان کے اسلام لانے ہی پر ان کی عزت و احترام اور آپؐ کی شخصی فراخ دلی اور رحمت کے طور پر تھا مگر یہ پورا پیراپڑھ کر صرف یہی تاثر ملتا ہے یا دیا جاتا ہے کہ ابو سفیانؓ ہمیشہ اسلام مخالف رہے اور مسلمان ہوئے یا نہیں بلکہ بالفاظ دیگر نہیں ہوئے۔

ان ساری گزارشات عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری نصابی کتب میں شامل قرن اول کی صرف انہی شخصیات کو داخل نصاب کیا جاتا ہے جو اقلیتی گروہ کے نزدیک قابل احترام ہوں اور ان کے متعلق معلومات بھی صرف وہی فراہم کی جاتی ہیں جو ان کیلئے قابل قبول ہوں۔ مثلاً نبی اکرم ﷺ اور حضرت خدیجہؓ کی باقی تین بیٹیوں کا عدم ذکر۔ اور اگر کچھ دوسری شخصیات کا ذکر بہ امر مجبوری کرنا بھی پڑے تو مسلمات کو چھپاتے ہوئے، مثلاً حضرت ابو سفیانؓ کے قبولِ اسلام کو مخفی رکھنا۔ کیا یہ تاریخ کے حصے بخرے کرنے اور قطع و برید کے مترادف نہیں؟ کیا یہ ایک اقلیتی گروہ کی پسند اور عقائد کو اکثریتی گروہ پر ٹھونسنے کے مترادف نہیں؟ کیا یہ عدل و انصاف کا خون نہیں اور کیا یہ کتمانِ حق و صداقت نہیں؟

یہ سب کچھ اگر سہواً ہے اور تھا تو مجھے امید واثق ہے کہ آپ اس طرف جلد توجہ دیں گے۔ اور اگر یہ قصداً ہے تو پھر ہم اس طوفان اور جدال کا انتظار کرتے ہیں جو تادیر ناانصافی برداشت کرنے کے رد عمل میں لازماً آیا کرتا ہے اور جب اصلاحِ تقصیر کام آتی ہے نہ سرکاری وعظ و نصیحت۔

والسلام، مخلص

جاوید اسلام خان

P.O.BOX=07، دوحہ قطر

پیش گفتار

از قلم : ڈاکٹرابو معاذ

(آخری قسط)

انیسویں صدی کے آخری نصف میں دیو بند کی تحریک کا آغاز ہو تا ہے۔ یہ لوگ بھی شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نظریات کے حامی تھے اور سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک سے متاثر تھے۔ ان لوگوں نے نسبتاً اعتدال کا راستہ اختیار کیا۔ فقہ حنفی کی حدود میں رہتے ہوئے خرافات کے خلاف تحریک چلائی' خانقاہی نظام کی کوتاہیوں پر تنقید کی اور اس کی اصلاح کی کوشش کرتے ہوئے اسے بیک قلم مسترد نہیں کیا' علمائے دین کو تیار کیا' انگریزوں کے خلاف عوام کو تیار کیا' زیر زمین جنگ لڑی اور ریشمی رومال تحریک جیسے منصوبے بنائے اور پھر دار ورسن کی صعوبات سہیں۔ خلوص اور فکری پختگی کی یہاں بھی کمی نہیں تھی' مقصد کے ساتھ لگن' ایثار اور دیانت داری کی ان کے ہاں بہتات تھی۔ یہ لوگ بھی انگریزوں کے غلبہ کے خلاف صف آراء تھے۔ یہ لوگ انگریزی تعلیم' تہذیب اور نظام کے مخالف تھے۔

تیسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو سُنّی حنفی تھے مگر روایات کے امین تھے۔ وہ ہر اُس روایت کو اپنائے ہوئے تھے جو ان تک برصغیر میں سینہ بہ سینہ اور عملی طور پر پہنچی تھی۔ یہ لوگ خانقاہی نظام کے حامی اور مؤیّد تھے' تصوف کے سلسلوں سے وابستہ تھے' سماع' موسیقی اور دیگر رسوم و رواج کے قائل تھے' فکر عجم کی چھاپ ان پر بہت گہری تھی' یہ لوگ اپنے عقائد میں مخلص تھے اور پوری دیانت داری سے قرآن و حدیث' فقہ اور روایات پر عمل پیرا تھے۔ خانقاہوں کا تو یہ حال تھا کہ بقول اقبال ؎

قُم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

یا ایک مقام پر یوں فرمایا؎

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تُو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی!

ان کے علماء اور مفکرین کی ذہنی استعداد اور دین سے لگن کسی بھی طرح کسی سے کم نہیں تھی، مگر عوام الناس کے ہاں کچھ تو جاہلانہ رسوم بھی نظر آتی تھیں جو کہیں کہیں پر قابل اعتراض ہو جاتی تھیں، تاہم ان کا تعلق نہ تو عقائد سے تھا اور نہ ہی علمائے کرام ان کو اچھا سمجھتے تھے۔ یہ لوگ یہ سب کچھ صدیوں سے دیکھتے اور کرتے آئے تھے اور یہ چیزیں ان میں رچ بس گئی تھیں۔ اس کا تعلق مذہب سے کم اور ذہنی حالت (Psyche) سے زیادہ تھا، اس سے ملتی جلتی روایات ہندوؤں میں بھی تھیں اور یہ دین اور مذہب کی بجائے ایک قسم کا کلچر تھا۔ جہاں تک دین کا تعلق تھا یہ لوگ بھی کسی سے کم نہیں تھے۔

برصغیر کے شیعہ حضرات جو کہ نسبتاً الگ تھلگ آبادیوں میں مقیم تھے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے زمانے کے بعد دیگر مسلمانوں کے ساتھ شیر و شکر تھے۔ ان کی ظاہری رسوم یعنی تعزیہ، عَلم اور ذوالجناح کے جلوس بھی ان کی طرزِ زندگی کے عکاس ضرور تھے مگر یہ مذہب کا حصّہ نہیں سمجھے جاتے تھے۔ یہ لوگ بھی کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول ﷺ پر عمل پیرا تھے۔ تاویل کچھ بھی ہو دین کے ساتھ ان کا شغف اور لگاؤ بھی واضح تھا۔ اگرچہ صفوی ایران اور بعد میں قاچاری ایران کے علماء کی آمد و رفت کے باعث ان کے ہاں کبھی کبھی فکری شدت آجاتی تھی مگر معدودے چند واقعات کے علاوہ سنیوں کے کسی بھی عالم نے انہیں دائرۂ اسلام سے باہر نہیں سمجھا اور نہ ہی انہوں نے باقی مسلمانوں کے ساتھ الجھاؤ کا رویّہ اختیار کیا۔ لیکن برصغیر کے شیعہ احباب کے ہاں کوئی تحرک اور زبردست قسم کی تحریک سامنے نہیں آئی جس کے باعث قدامت پرستی کا غلبہ رہا، جبکہ اس دَور کے ایران میں جہاں کئی اصلاحی تحاریک چلتی رہیں صفوی دور کے سخت گیر نظریات آہستہ آہستہ ماند پڑتے چلے گئے اور لوگ اعتدال کی طرف مائل ہوتے چلے گئے۔ تاہم انگریزوں کے برصغیر اور ایران کے مابین قائم کردہ آہنی پردہ (iron curtain) کے باعث وہاں کی اصلاحی تحاریک کا اثر برصغیر کے شیعہ احباب پر کم ہی پڑتا محسوس ہوا۔ ہر طرح کی قومی اور عملی جدّوجہد میں شیعہ مسلمان اور سُنّی مسلمان ہمیں یک جان نظر آتے ہیں اور گزشتہ

دو صدیوں کی تاریخ میں ایک دوسرے کے لئے احترام اور اخوت کے جذبات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

اب ہم دوبارہ ایران چلتے ہیں جہاں صفوی دور سے بادشاہت کے تحفظ کے لئے واضح طور پر سنّی ترکی اور سنّی ہندوستان کے مقابلہ میں ایسی صورت سامنے آرہی تھی جہاں افعال' اعمال اور ظاہری رسوم و رواج میں واضح فرق نظر آرہا تھا۔ یہ فرق ہر چیز میں تھا۔ امامت کے تصور اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بابت نظریاتی اختلاف کے علاوہ کوئی بھی واضح فکری اور مذہبی فرق ہر چند وہاں کے شیعہ اور ارد گرد کے ممالک کے سنی مسلمانوں میں نہیں تھا مگر ظاہری طور پر رسوم و رواج کافی حد تک مختلف تھے۔ صفوی بادشاہ اور بعد کے قاچاری بادشاہ امامِ وقت کے ٹرسٹیز (Trusties) سمجھے جاتے تھے اور شاہی نظام کے زبردست تعاون سے علماء کرام اور مشائخ انتہائی معزز اور محترم تھے کہ علماء نے بتدریج ایسا مربوط اور منظم نظام قائم کردیا جو ایرانی معاشرے کا سب سے منظم نظام تھا اور اس کا رابطہ نچلی سطح تک عوام سے تھا اور بالائی سطح پر ان کی رشتہ داریاں شاہی خاندان سے تھیں۔ یہ لوگ شاہی نظام کے سرپرست اور حامی تھے۔ ان کے نظام کی سوچ ایک ہی تھی اور شاہی استبداد کی تابع تھی۔ یہ لوگ رسوم و رواج اور فکر عجم کے منفی پہلوؤں کی آبیاری کرتے ہوئے ایک قوم کو متحد رکھے ہوئے تھے مگر فکری آزادی کا فقدان تھا' لیکن روشن فکر مذہبی اسکالر اس تمام سلسلے پر چیں بجبیں ضرور تھے اور بقول اقبال یہ کہہ رہے تھے ؎

تیری طبیعت ہے اور تیرا زمانہ ہے اور　　تیرے موافق نہیں خانقہی سلسلہ

کچھ اور لوگ بھی ان کی بات سمجھ رہے تھے مگر وہ مصلحت سے کام لے رہے تھے ؎

اس کی خودی ہے ابھی شام و سحر میں اسیر　　گردشِ دوراں کا ہے جس کی زبان پر گلہ

شاہی نظام کسریٰ کے استبدادی نظام کا تسلسل تھا۔ وہ فکری کہنگی جسے اسلام نے ختم کر کے حیاتِ نو بخشی تھی ایران پر اسے دوبارہ مسلط کیا جا رہا تھا مگر تھی وہ مذہب کے پردے میں بند۔ مذہب اور استبداد کا یہ امتزاج ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا ؎

یا شرع مسلمانی یا دیر کی دربانی　　یا نعرۂ مستانہ کعبہ ہو کہ بُت خانہ

میری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں　　کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ

انیسویں صدی عیسوی کا آغاز ایران میں قاچاری عہد کا ابتدائی زمانہ تھا۔ لوگوں میں بیداری کی لہر دوڑ رہی تھی اور ایران روس کے ہاتھوں سخت ہزیمت سے دوچار تھا۔ اس صدی کے پہلے نصف میں ایران اپنے یورپی مسیحی مقبوضات جارجیا اور آرمینیا سے محروم ہو گیا اور پھر زارِ روس نے آذربائیجان کے ساٹھ فیصد سے زائد رقبہ پر قبضہ کر لیا۔ پھر ترکمانستان، ازبکستان اور تاجکستان بھی ایران کے ہاتھوں سے جاتے رہے۔ ۱۸۲۸ء کے شرمناک معاہدہ کے بعد فتح علی شاہ قاچار نے ان تمام خطوں سے اپنی دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ اب عوام مایوسی کا شکار ہونے لگے اور ان کے ہاں سکونِ قلبی کا کوئی سامان نہ رہا۔ دربار سے وابستہ جاگیردار علماء انہیں شاہ سے وفاداری کے لئے مائل کرنے کی غرض سے ہر ممکنہ کوشش کرتے رہے۔ بالآخر انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس فساد اور تباہی کے عہد میں اب امامِ غائب کا ظہور ہونے والا ہے اور امامِ وقت مہدیٔ آخر زمان آکر ہمارے تمام مسائل کا حل کر دیں گے۔ عوام ظن و تخمین کا شکار تھے، سوچیں غلط سمت پر رواں دواں تھیں اور بقول اقبال ؎

عقلِ بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں — راہبر ہو ظن و تخمین تو زبوں کارِ حیات
فکر بے نور ترا، جذبِ عمل بے بنیاد — سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات

مگر ایک بات پر سب متفق تھے کہ

دنیا کو ہے اُس مہدیٔ برحق کی ضرورت — ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

اس نظریاتی بحران کا فائدہ اٹھانے والا شیراز کا نواز علی محمد باب تھا جس نے مہدیٔ موعود کے ایلچی ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے یہ باور کروایا کہ امامِ زمان اسے ملتے ہیں اور وہ ان کا پیام لوگوں تک پہنچا رہا ہے۔ باب نے آزادیٔ افکار کا پرچار کیا اور لوگوں کو یہ درس دیا کہ وہ علماء اور شاہ کے مسلط کردہ نظام پر تنقید کریں اور ہر طرح کی تقلید سے آزاد ہو کر اس کی پیروی کریں۔ غرض وہ انہیں ہر بند سے آزاد کرنا چاہتا تھا بقول اقبال ؎

ہر سینہ نشیمن نہیں جبریلِ امیں کا — ہر فکر نہیں طائرِ فردوس کا صیّاد
گو فکرِ خدا داد سے روشن ہے زمانہ — آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

جہاں تک باب کا تعلق ہے وہ فکری آزادی کے علاوہ ہر قید مکان و زمان سے آزادی کا طالب تھا اور بقول اقبال وہ تو قرآن کو بھی اعراب سے آزاد کرنا چاہتا تھا ؎

تھی خوب حضورِ علماء باب کی تقریر بیچارہ غلط پڑھتا تھا اعرابِ سمٰوٰت
اس کی غلطی پر علماء تھے متبسم بولا تمہیں معلوم نہیں میرے مقامات
اب میری امامت کے تصدق میں ہیں آزاد محبوس تھے اعراب میں قرآن کے آیات

لوگ اس کے گرد جوق در جوق جمع ہونے لگے اور شاہی استبدادی نظام ایک عظیم خطرے سے دوچار ہو گیا۔ رہی سہی کسر اس کی ایک مرید خاتون نقطہ قزوینی (جسے طاہرہ قرۃ العین کا لقب دیا گیا) نے کر دی۔ اس انتہائی پڑھی لکھی اور ذہین خاتون کا تعلق قزوین و اصفہان کے معزز مذہبی خاندان سے تھا۔ اس نے باب کی پیروی میں گھر کو خیرباد کہا اور اپنی شاعری اور تبلیغ کے ذریعے خواتینِ ایران کو آزادیٔ نسواں کا شیطانی درس دینا شروع کیا۔ حسن و جمال اور شعر و سخن کے علاوہ وعظ و خطبہ میں اس کی کوئی مثال نہیں تھی۔ اس خاتونِ عجم نے بغداد میں اپنی جلاوطنی اور پھر ایران میں آوارگی کے زمانے میں نوجوانانِ ایران کو تحرک اور ابلیسی آزادی کا درس دیا۔ باب کو تبریز میں گولیوں کی باڑ سے اڑا دیا گیا اور طاہرہ کو تہران میں اندھے کنویں میں پھینک کر ابدی نیند سلا دیا گیا مگر یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ باب کے ایک مرید میرزا حسین نے بہاء اللہ کے لقب سے مہدی آخر زمانی کا دعویٰ کر دیا اور اعلان کر دیا کہ اس کے پیرو کار (جو پہلے بابی کہلاتے تھے) اب بہائی مذہب کے ماننے والے ہیں اور نعوذ باللہ آنحضور ﷺ کی نبوّت کا عہد ختم ہو چکا ہے اور قرآن منسوخ ہو چکا ہے (نقل کفر کفر نباشد) اور یہ کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور ارکانِ اسلام اب منسوخ سمجھے جائیں گے۔ یہ شخص اپنے مریدوں سمیت جلاوطن ہو کر ترکی چلا گیا اور ادرنہ کے مقام پر واصل جہنم ہوا۔ اس کے بیٹے عبدالبہاء نے اپنے ساتھیوں کو ساتھ لیا اور فلسطین چلا گیا، جہاں پر جنرل ایلن بی کو فلسطین پر قبضہ میں مدد دی۔ ایران میں جا بجا بہائی اور بابی موجود تھے جن کی بیخ کنی کے لئے علماء نے سخت مہم چلائی اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ حال ہی میں انقلابِ ایران کے بعد یہ لوگ بڑی تعداد میں ایران سے نکل کر امریکہ اور مغربی ممالک میں روانہ ہو گئے اور بہت سے افراد نے عارضی طور پر کافی عرصہ پاکستان میں قیام کئے رکھا۔ یہ ماننا پڑے گا کہ ایرانی علماء اور عوام نے ان سے کوئی رو رعایت نہیں کی۔ ادبی حلقوں تک میں طاہرہ کا نام اور کلام ایک شجر ممنوعہ سمجھا جانے لگا۔

ہرچند کہ فکری بیداری کا ابتدائی مرحلہ غلط سمت کی جانب گامزن ہو کر اپنے منطقی انجام کو پہنچا مگر فکری بیداری کی یہ لہر ختم نہیں ہوئی۔ انیسویں صدی کا دوسرا نصف انگریزوں اور روسیوں پر اپنے تسلط کے قیام کی جنگ تھی۔ ایک بفر سٹیٹ کے طور پر افغانستان کو وسعت دینے کے لئے انگریزوں نے ہرات اور خراسان کے اردگرد کے علاقے ایران سے افغانستان کو منتقل کروا دیئے اور ایران نے جب ان علاقوں پر قبضے کی کوشش کی تو خلیج فارس میں برطانوی بحری بیڑے کی موجودگی میں انگریزوں کے الٹی میٹم کے نتیجہ میں ایران کو ہرات کا محاصرہ چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔ ایران نے فرانس کی جانب ہاتھ بڑھایا مگر چنداں کامیابی نہ ہو پائی۔ اقتصادی اعتبار سے ایران کو تباہ کرنے کے لئے انگریزوں نے تجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے لئے شرمناک شرائط پر معاہدے کئے۔ ان معاہدوں کے ردّ عمل کے طور پر ایرانی قصبے اسد آباد کے ایک روشن فکر جوان جمال الدین نے عوام کو شاہ سے بغاوت پر اکسایا۔ عوام میں شعوری بیداری پیدا کرنے کے بعد سید جمال الدین نے مذہبی قیادت کی جانب امید بھری نگاہوں سے دیکھا اور پھر کسی نہ کسی طرح علماء کی حمایت اور آیت اللہ العظمیٰ سید حسن شیرازی کے فتوے کے حصول کے بعد عوام میں بغاوت کی ایک خوفناک کیفیت پیدا کر دی۔ یہ بات ثابت ہو گئی کہ ایران میں کسی بھی سیاسی تحریک کی کامیابی کے لئے علماء کی حمایت بہت ضروری ہے۔ ہرچند کہ حضرت حسن شیرازی کے فتوے کے بارے میں بہت سی متضاد آراء ہیں کہ وہ جعلی تھا یا اصلی، مگر اس فتوے کا اثر شاہی محل کی خواتین تک ہوا۔

جمال الدین اسد آبادی جلاوطن ہوئے اور ایران سے نکال دیئے گئے۔ وہ ہندوستان بھی آئے، جہاں وہ جمال الدین افغانی کے نام سے مشہور ہوئے۔ پھر وہ ترکی، مصر اور دیگر ممالک سے ہوتے ہوئے برطانیہ چلے گئے۔ سید جمال الدین اسد آبادی کے ایک مرید نے ناصرالدین شاہ قاچار (بادشاہ ایران) کو انیسویں صدی کے آخر میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پارلیمنٹ میں آزادی اظہار اور انسانی حقوق کی جدوجہد چلی اور پھر ۱۹۰۶ء میں ایران کا آئین منظور ہوا جس کی رو سے شاہ کے اختیارات محدود کر دیئے گئے، ملک کو اسلامی مملکت قرار دے دیا گیا اور عوام کو مذہب کے دائرۂ کار میں حقوق عطا ہو گئے۔ جمال الدین کی شخصیت، ان کے رفقاء اور دیگر انقلابی افراد نے اسلام کا درس دیا،

وہ تشیع کی آڑ میں آگے نہیں آئے بلکہ وہ ہمیں ہر لحاظ سے فرقہ واریت سے آزاد نظر آتے ہیں۔ یہ آئین اس حد تک اسلامی تھا کہ شاہ کے آخری ایام میں اور امام خمینی کی جلاوطنی کے دور کے سب سے اہم مذہبی رہنما آیت اللہ حاجی کاظم شریعت مدار اسی آئین کی بحالی کا مطالبہ کر رہے تھے۔

لیکن یہ آئین شہنشاہِ وقت اور استبدادی استعماری قوتوں کے لئے قابل قبول نہیں تھا۔ شاہی فوج اور عوام آپس میں دست و گریبان ہو گئے۔ محمد علی شاہ قاچار کو ایران سے جلاوطن کر دیا گیا مگر وہ روسی توپخانے کی مدد سے کرنل لیاخوف کی ہمراہی میں تہران میں آن دھمکا اور پارلیمنٹ پر بمباری کروادی۔ ایک بار پھر شاہ کو نکال باہر کیا گیا اور اس کے نابالغ بیٹے احمد شاہ قاچار کو علامتی طور پر بادشاہ تسلیم کر لیا گیا' مگر طاقت عوام کے ہاتھ آ گئی۔ لیکن شاہی نظام سے باہر مؤثر انفراسٹرکچر کی عدم موجودگی نے مغلیہ دور کے آخری ایام کی طرح صورت پیدا کر دی۔ ایران کے جنوب اور مشرق میں انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا' ہر چند کہ انہوں نے باقاعدہ حکومت کا اعلان نہیں کیا' اور شمال میں روس نے اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا۔ انقلابِ روس کے حالات کے باعث شمال میں ایران نے قدرے سکون کا سانس لیا۔ وہاں مرزا کوچک کی سربراہی میں گیلان اور مازندران کے صوبوں میں طالبان طرز کی سیدھی سادھی اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔ یہ لوگ انتہائی مخلص' دیندار اور بے لوث تھے۔ یہ لوگ جنگل میں اپنا دائرۂ کار وسیع کرتے چلے گئے۔ بالشویک روس نے انقلاب کے بعد انہیں اپنے ساتھ ملانا چاہا اور مرزا کوچک کی حکومت کو سوویٹ جمہوریہ کے طور پر یونین میں شامل کرنے کی دعوت دی جو ٹھکرا دی گئی۔ سوویٹ یونین کے جنوبی مسلمان خطہ کے قریب ایک اسلامی حکومت کا قیام روس کے لئے کافی پریشانی کا باعث بنا اور روسیوں نے ان کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ جنوب میں انگریزوں نے کرنل رضا خان کی حکومت کو مضبوط بنایا اور اس کو مرزا کوچک کی سرکوبی کے لئے مدد فراہم کی۔ انگریزی فوج میں موجود مسلمان لوگ جن کا تعلق ان علاقوں سے تھا جو اب پاکستان میں شامل ہیں بڑی تعداد میں مرزا کوچک کے گروہ میں شامل ہو گئے' مگر مرزا کوچک کی حکومت کے خاتمے کے بعد یہ لوگ پکڑے گئے اور بغداد میں پھانسی پر لٹکا دئے گئے۔

کرنل رضاخان نے مصطفیٰ کمال پاشا کی طرز پر ایران میں صدر جمہوریہ بننا چاہا مگر علماءِ قم کا خیال تھا کہ کہیں ترکی کی طرز پر یہ شخص ایک سیکولر حکومت قائم نہ کردے۔ اس سے خائف ہو کر انہوں نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ خود ایران کا بادشاہ بن جائے۔ ابھی تک علماء کے پاس جاگیریں موجود تھیں اور انہوں نے بادشاہ سے ہر طرح کا تعاون کیا۔ یہ شخص رضا شاہ کے نام پر ۱۹۲۵ء میں ایران کا بادشاہ بن گیا اور پھر آہستہ آہستہ اس نے ایران میں انارکی اور طوائف الملوکی کو ختم کر کے ایک مرکزی حکومت قائم کی۔ اس استحکام کی تعریف علامہ اقبال نے بھی فرمائی اور کہا ؎

پہلوی آں وارثِ تختِ قباد ناخنِ او عقدۂ ایراں کشاد
آں کہ بر تقدیرِ مشرق قادر است عزم و حزمِ پہلوی و نادر است

یعنی رضا شاہ پہلوی نے تخت قباد (ایران کا قبل از اسلام کے ساسانی دور کا بادشاہ جو نوشیروان کا باپ تھا) کے وارث کے طور پر ایران کی گتھی کو اپنے ناخن تدبیر سے سلجھا دیا اور وہ لوگ جو مشرق کی تقدیر بدل سکتے ہیں وہ رضا شاہ اور افغانستان کے نادر شاہ ہیں۔

لیکن جلد ہی علامہ اقبال حقیقت کی تہہ تک پہنچ گئے اور انہوں نے رضا شاہ پہلوی کے عزائم کو بھانپ لیا جس نے بتدریج ایران میں مغربی نظام کو نافذ کرنا چاہا اور اس کے اسلامی تشخص کو مٹانے کا عزم کر لیا۔ اب اسلامی تشخص کو مٹانے کے لئے اس نے قدیم ایرانی تاریخ پر فخر و مباہات کو وسیلہ بنانا چاہا۔ علامہ اقبال نے فرمایا ؎

مری نوا سے گریبانِ لالہ چاک ہوا نسیمِ صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی!
نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!
مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی!

علاوہ بریں "جاوید نامہ" میں تو آپ نے انتا کر دی۔ جب آسمان پر آپ کی ملاقات نادر شاہ افشار سے ہوتی ہے جو آپ سے ایران کی موجودہ صورتحال کے بارے میں پوچھتا ہے تو آپ ان الفاظ میں جواب دیتے ہیں ؎

پس ز مدّت چشم را بر خود کشاد لیکن اندر حلقۂ دامے فتاد
کشتۂ نازِ بتانِ شوخ و شنگ خالقِ تہذیب و تقلیدِ فرنگ
کارِ آں درافتۂ ملک و نسب ذکرِ شاہ پور است و تحقیرِ عرب
روزگارِ اُو تہی از واردات از قبورِ کہنہ می جوید حیات

با وطن پیوست و از خود درگذشت   دل بہ رستم داد و از حیدر گذشت
نقش باطل می پذیرد از فرنگ   سرگذشت خود بگیرد از فرنگ

یعنی ایک طویل زمانہ گزرنے کے بعد اس میں بیداری کی لہر اٹھی تھی لیکن وہ ایک اور دام میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ وہ سرزمین جو ایک عظیم تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھی آج شوخ خوبصورت چہروں کے سحر میں مبتلا ہو کر اہل مغرب کی تقلید کرنے لگی ہے۔ ایک بار پھر وہ وطنیت اور حسب و نسب پر فخر میں مبتلا ہو کر شاہ پور ساسانی (عربوں کے دشمن ایرانی بادشاہ) کا ذکر کر کے عربوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہی ہے۔ وہ نئے دور کے تقاضوں سے بے خبر ہے اور قدیم زمانے کے کھنڈرات اور قبروں میں زندگی کو تلاش کر رہی ہے۔ وطنیت کے نشے میں مست ہو کر وہ اپنے (اسلامی) تشخص سے ہاتھ دھو رہی ہے (اور یوں لگتا ہے جیسے) رستم (و سہراب) کی داستانوں کے طلسم میں مبتلا ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دامن چھوڑ رہی۔ الغرض ہر قسم کے باطل نظریات وہ قوم اہل مغرب کے ہاں سے درآمد کر رہی ہے اور اپنی تقدیر کے اوراق (سرگذشت) بھی اہل مغرب سے حاصل کر رہی ہے۔

اس سے زیادہ دلکش پیرائے میں اس دور کی تصویر کھینچی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ علامہ اقبال کو وہاں مایوسی کے سایوں میں امید کی کرن نظر آ رہی تھی۔ وہ تہران کے اہل مشرق کا جنیوا بننے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ اس بے آب و گیاہ سرزمین کے پُرنم ہو کر زرخیز ہونے کا انتظار فرما رہے تھے اور تبریز سے کسی رومی کے ظہور کے منتظر تھے۔ آپ کو فکری تہذیبی اور تاریخی ورثے کی حامل اس قوم سے نہ صرف مستقبل کی قیادت کی توقع تھی بلکہ وہ خود کو اور وادیٔ سندھ کے مسلمانوں کو اسی عظیم تہذیب و تمدن کا جزو قرار دے رہے تھے اور ایران کے نوجوانوں کو پیام دے رہے تھے کہ؂

حلقہ گردِ من زنداے پیکرانِ آب و گِل   آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شما!

اے ایران کے نوجوانو! اے کچی مٹی اور پانی سے بنے ہوئے کچے مجسّموں جیسے لوگو! آپ میرے اردگرد اس لئے جمع ہو جاؤ کہ میرے سینے میں آپ کے آباء واجداد کی لگائی ہوئی آگ جل رہی ہے جس کی تمازت سے تم پک کر مضبوط، مستحکم اور پختہ ہو جاؤ گے۔

رضا شاہ پہلوی کا عہد جاری تھا کہ ایران دوسری جنگ عظیم میں گھر کر رہ گیا۔

روس، امریکہ اور برطانیہ نے اس پر اس لئے قبضہ کرلیا کہ کہیں جرمنی کا آریائی استعمار اس پر پہلے قابض نہ ہو جائے۔ رضا شاہ کو جلاوطن کر دیا گیا اور اس کے اٹھارہ برس کے بیٹے محمد رضا شاہ کو حکومت کا علامتی سربراہ بنا کر ملک کی عنانِ اقتدار قابض قوتوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ ہر سو مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ یہ وہی دور تھا جب مسلمانانِ ہند ۱۹۴۰ء کی قرار دادِ لاہور پاس کر کے ایک علیحدہ تشخص کے لئے سرگرمِ عمل تھے۔ اس خطہ کے مسلمان تحرک اور سعی و عمل کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ بیداری کی ایک لہر موجود تھی اور اس لہر کے پس منظر میں حضرت علامہ اقبال کے فکر کی گہری چھاپ تھی۔ ایران کے لئے بھی ایک ہی راستہ تھا، یا چناں کن یا چنیں والا معاملہ تھا۔ اب بحث وہیں پر جا پہنچی تھی جہاں اسلام کے ہاتھوں ایران کی فتح کے موقع پر تھی۔ یا اسے ساسانی (قبل اسلام کے) تشخص کی جانب لوٹ جانا تھا یا اسلام کو دل و جان سے قبول کرنا تھا۔ عام لوگوں کے دل اب بھی اپنے مذہب اسلام کی محبت سے سرشار تھے، ہاں فکر عجم ان کے افکار و عقائد میں پوری طرح موجزن تھا، مگر فکر عجم مذہب اسلام کے بنیادی اصولوں سے متصادم نہیں بلکہ ان میں غوطہ زن تھا، تاہم کچھ خامیاں بھی تھیں جو قابل اصلاح تھیں اور ان کو دین کا جزو نہیں بلکہ کلچر اور ذہنی کیفیت (Psyche) کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ایران میں عیدین سے بھی زیادہ اہم تہوار نوروز کا تھا جسے مذہبی حلقے بھی پورے طمطراق سے منایا کرتے۔ یہ دن جمشید بادشاہ (اساطیری عہد کے) کی فتوحات کے بعد وطن واپس لوٹنے کی خوشی میں منایا جاتا تھا۔ یہ دن برصغیر میں بھی اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے پہلے پوری شان و شوکت سے منایا جاتا تھا۔ اس طرح یہ عید وہاں کے لوگوں کی نفسیات میں پختہ ہو چکی ہے۔ افغانستان اور تاجکستان کا بھی یہی حال ہے۔ انقلاب کے بعد بھی ایران میں یہ جشن سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور رہے گا۔ اسی طرح وہاں کا فن پھلوانی ہے، پھولوں کے ساتھ لگاؤ ہے، باغ کی سیر ہے جسے **گلگشت** کا نام دیا جاتا ہے، شعر و سخن ہے، گھروں میں قالین اور سماور کا استعمال ہے۔ یہ تمام اجزاء وہاں کے فرہنگ (Culture) کا حصہ ہیں اور جب تک دین کے بنیادی اصولوں سے متصادم نہیں ہیں ان کے وہاں پر رائج رہنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔

لیکن جب مغربی قوتوں کی سرپرستی میں ایران میں جاہلیت کی وطنیت پرستی اور ملّی

حمیت کو دوبارہ زندہ کر کے تاریخ کے اس مرحلے پر لا کھڑا کر دیا گیا جہاں وہ اپنے زردشتی تشخص کو قائم رکھنے کے لئے صحابہ کے لشکر سے برسرپیکار تھے تو صورتحال سنگین ہو گئی۔ گویا کہ یزدگرد کا زمانہ واپس آگیا ہو اور عہدِ اسلامی کے تمام مذہبی، فکری اور عملی ورثے اس سرزمین پر ایک بوجھ محسوس ہو رہے ہوں۔ مغربی استعمار کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایران میں خواتین کو بے پردہ کر دیا گیا، عریانی کو عام کر دیا گیا، مغربی تہذیب اپنانے کی ترغیب دی گئی، شراب عام ہو گئی، عیش و عشرت کے اسباب مہیا کر دیئے گئے، عورت کو جنسی تسکین کا ذریعہ بنالیا گیا، عشرت کدے کھل گئے، مخلوط تعلیم اور مخلوط محافل کی حوصلہ افزائی کی گئی، رقص و سرود عام ہو گئے۔ یہ سب کچھ ایران کی ذہنیت (Psyche) کا عکاس نہیں تھا، یہ تو شیطانِ بزرگ کے وسوسے تھے جو عملی صورت اختیار کر چکے تھے۔

اس اہم موقعے پر حضرت علامہ اقبال کے افکار و اشعار ایران پہنچے تو انہوں نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ پھر اقبال کی پیروی میں بہار، سرمد، محمد حسین خطیبی اور احمد سروش نے لکھا اور پھر ڈاکٹر علی شریعتی کی قد آور شخصیت ابھری۔ یہ تمام لوگ دانشور تو تھے مگر روایتی علماء نہیں تھے۔ ڈاکٹر شریعتی ہرچند عظیم مذہبی فلسفی تھے مگر ان کا تعلق بھی علماء کے نظام ((Heirarchy سے نہیں تھا۔ کچھ عرصہ تک تو علماء نے بھی شاہی نظام کو تحفظ فراہم کیا مگر انیس سو ساٹھ کی دہائی میں صورتحال ناقابل برداشت ہو گئی اور آیت اللہ العظمیٰ روح اللہ خمینی نے استبداد سے ٹکرانے کا عزم کر لیا۔ اب ایک بار پھر روشن فکر مفکرین کی آزادی کی تحریک میں علماء کی حمایت کا عنصر نہ صرف شامل ہو گیا بلکہ قیادت علماء کو منتقل ہو گئی۔ ہرچند کہ حضرت آیت اللہ خمینی ایک روایتی عالم دین تھے اور ان کی تربیت بھی خالصتاً اسی نظام میں ہوئی تھی مگر آپ نے شاہی استبداد کے مقابلہ، جلاوطنی، اور غریب الدیاری کے عہد میں اگر کوئی بات کی تو اسلام کے احیاء اور ایران کو خالصتاً اسلامی تشخص دلانے کی ہی کی۔ ہرچند کہ ابتدائی زمانہ کے ان کے افکار اور تحریر کچھ بھی ہوں مگر اس تمام تر دور میں آپ نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس پر تشیّع کا احتمال ہوتا ہو۔ آپ کی عدم موجودگی میں ایران میں حضرت آیت اللہ محمود طالقانی، آیت اللہ شریعت مدار اور دیگر علماء کی کاوشیں بھی قابل ستائش رہیں اور تمام تر امریکی حمایت اور مضبوط فوج اور انٹیلی جنس کی موجودگی شاہی نظام کو نہ بچا سکی اور ایک بار پھر "ھلک کسریٰ و

لا کسری بعدہ" کی نبوی پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی' شاہی استبدادی نظام کا خاتمہ ہو گیا اور ایران میں اسلامی انقلاب برپا ہو گیا' بقول اقبال ؎

باز زندہ کن تو آن رسمے کہ از تاثیرِ وے بوریائے رہ نشینے سر زند با تختِ کے

پھر اُس رسم کو زندہ کر دو جس کی تاثیر سے ایک درویش کا بوریا تخت کیان سے ٹکرا جائے۔

ہم ان تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے مزید آگے بڑھتے ہیں اور یہ بات ذہن نشین کرواتے ہیں کہ ایران میں جب کوئی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی تو اس کی قیادت مخلص علماء کے ہاتھوں میں رہی جن کا کردار کسی بھی شک و شبہ سے بالاتر تھا' مگر انڈونیشیا' مصر' ترکی اور برصغیر میں قیادت نسبتاً مغرب زدہ لوگوں کے ہاتھوں میں رہی۔ یہ دراصل عوام کا انتخاب تھا اور عوام کی نفسیات میں کچھ نہ کچھ ضرور موجود تھا جو انہیں علماء سے الگ تھلگ رکھے ہوئے تھا یا پھر اعتماد کا فقدان تھا۔ برصغیر میں اہم مذہبی تحریکوں کو عوام کی حمایت لازماً حاصل رہی ہے مگر آزادی کے بعد ان کا کردار کافی حد تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اگر ہم برصغیر میں ایک اور پہلو کو بھی اجاگر کریں تو وہ سرسیدی طبقے کی روشن فکر تحریک کا ہے۔ یہ رامپور کے صدر الصدور (قاضی القضات) ہی تھے جن کا نام تھا سید احمد خان۔ آپ نے آئین اکبری (ابو الفضل علامی کی فارسی کتاب) کی تدوین فرمائی تھی۔ یہ کتاب فکر عجم کا ایک نادر نمونہ تھی جسے شاہ ایران (محمد رضا شاہ) کے زمانہ میں فرہنگستان کے ادارہ میں ایک نمونے (gold standard) کے طور پر سامنے رکھتے ہوئے صحیح فارسی تحریر و فکر کے احیاء کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ سید احمد خان نے اس کا تدوین شدہ نسخہ مرزا اسد اللہ خان غالب کے پاس بھجوا دیا جو کہ ایک عظیم فارسی شاعر تھے اور ان کے اردو اور فارسی کلام میں فکر عجم کے منفی پہلوؤں کے علاوہ بہت کم مواد ملتا ہے۔ مرزا غالب نے سید احمد خان کو اس کا دیباچہ لکھ کر دیا تو یوں کہا ؎

گر ز آئیں می رود با ما سخن چشم بکشا اندریں دیر کہن
صاحبانِ انگلستاں را نگر شیوہ و اندازِ ایشاں را نگر
پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار گشت آئینِ دگر تقویم پار

یعنی اگر ہم سے آئین کی بات کرتے ہو تو اس پرانے جہان میں آنکھ کھول کر دیکھو۔

انگلستان کے لارڈز کو دیکھو اور ان کے شیوہ و انداز کی پیروی کرو۔ ان کے منظام کی صورت میں جو آئین دنیا کو ملا اس کے سامنے تمام آئین ماضی کے کیلنڈر بن گئے۔

اور آگے چل کر یوں کہا: "مُردہ پروردن مبارک کار نیست" یعنی مُردوں کا پالنا اچھا کام نہیں ہے۔

پھر سید احمد خان مغربی آئین کو اپنا کر سر سید احمد خان بن گئے۔ آپ نے انگریزی سیکھنے اور اس کی پیروی کو برصغیر کے مسلمانوں کے لئے عام کرنا چاہا۔ ان کو حالی اور ذکاء اللہ جیسے دردمندوں کی حمایت بھی حاصل ہو گئی اور ایک ایسی تحریک بھی چلی جس کی فکری بنیاد بہت کمزور تھی اور ظاہری مفادات کی طرف نظر تھی، لیکن اس تحریک نے مسلمانوں میں بیداری کی ایک لہر ضرور دوڑا دی۔ اس بیداری کی لہر کا یہ اثر ہوا کہ لوگ منطقی استدلال کی راہ پر چل نکلے اور اسلام میں موجود فکر عجم کے منفی پہلوؤں کے خلاف ایک بغاوت کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی۔ دوسری جانب اس آزادی نے قرآن کے مطالب کو احادیث، اقوال اور مفسرین کی کاوشوں سے حاصل کردہ معانی و مطالب سے آزاد کر دیا اور کئی لوگ اس کی تاویل اپنے اپنے آزادانہ انداز میں کرنے لگے اور انہوں نے فکر عجم کے پہلو قرآنی مطالب پر اس قدر حاوی کر دیئے کہ شاعر مشرق کو کہنا پڑا ؎

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے — حریت افکار کی نعمت ہے خدا داد
چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدۂ پارس — چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر — چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد!
ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشہ — اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد!

اور ایک موقع پر تو یوں کہہ دیا کہ ؎

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر — تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند

اب حضرت علامہ اقبال نے ایک متحرک سوچ کے ذریعے مسلمانانِ ہند کو فکری ورثہ سے مالا مال کرتے ہوئے ان کے لئے ایک نئی جہت کا تعین کر دیا۔ آپ کے افکار کو عملی صورت عطا کرتے ہوئے مسلمانانِ ہند نے قائداعظم کی قیادت میں ایک الگ وطن بھی حاصل کر لیا، مگر قیام پاکستان کے بعد فکر اقبال کو پس پشت ڈالنا شروع کر دیا اور پھر باہمی اختلافات سامنے بھی آنا شروع ہو گئے، کبھی رنگ و زبان اور قبائل کے تعصب کی

صورت میں اور کبھی فرقہ واریت کی صورت میں' جبکہ ان تمام تر فرقوں کی حقیقت ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ مختلف قسم کی اصلاحی تحریکیں تھیں اور شیعہ' سنی' اہل حدیث' سب کے سب کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول پر متفق تھے اور رہیں گے۔ فکر عجم نے ان میں اختلافات کی گنجائش ضرور رکھ دی تھی۔ اب فکر عجم کے ان منفی پہلوؤں سے پہلو تہی کرتے ہوئے اسلام کی اصل کی جانب لوٹنے کا وقت تھا جسے اقبال نے بڑے خوبصورت پیرائے میں یوں بیان کیا ہے ؎

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

اگر ہم ان تنگ نظرانہ اختلافات سے پہلو تہی کر لیں' اگر افغانستان امن کا گہوارہ بن جائے' اگر تاجکستان میں صورتحال معمول پر آجائے تو یہ وحدت عظیم قوم کی صورت میں ڈھل سکتی ہے جو "وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ" کی مصداق ہے' جس کی وضاحت خود ہادی برحق نے فرمائی تھی۔ یہ اس عظیم خراسان پر پھیلی ہوئی قوم ہے اور اس میں اسلام کی روح کا جلال و جمال جلوہ فگن ہے۔ ایران' پاکستان اور دیگر فارسی علاقے ایک عظیم ورثے کے حامل ہیں جس کی مثال سلمان فارسی رضی اللہ عنہ تھے جنہیں آنحضور ﷺ نے اہل بیت میں ایک فرد کے طور پر اپنا لیا تھا۔ یہ لوگ ثریا سے بھی دین کی حقیقت لے آنے پر قادر ہیں۔ یہ لوگ غزالی' رازی' رومی اور اقبال کے فکری وارث ہیں۔ یہ لوگ نظام کو بدلنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ یہ لوگ "اَسْلِمْ تَسْلَمْ" کے مصداق ہیں اور اسلام قبول کر کے سلامتی میں داخل ہو چکے ہیں۔ اور وہ لوگ جنہوں نے حضور ﷺ کے پیغام کو رد کیا تھا وہ جملہ مجوسیوں کے گناہوں سمیت غارت ہو چکے ہیں۔ ان کی جنگی تزویرات کو حضور ﷺ نے اپنایا تھا' ان کے لباس کی تعریف کی تھی' ان کے افراد جب یمن اور بحرین سے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے تو حضور ﷺ نے انہیں توقیر بخشی تھی۔ یہ وہ قوم ہے جس کے فرد سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی بابت اقبال نے کہا تھا ؎

فارغ از اُمّ و اَب و اَعمام باش ہمچو سلماں زادۂ اسلام باش!

یعنی اپنے ماں' باپ اور چچاؤں کے فخر سے نکل کر سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی طرح اسلام کا فرزند بن جاؤ۔ یہ قوم خود کو اسلام کا وارث بنا لے۔ اور بقول اقبال ؎

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا اِلٰہ اِلاّ لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

اور دل کی گواہی بہت ہی اہم مگر مشکل کام ہے۔ بقول اقبال ؎

رقصِ جاں آموختن کارے بود غیرِ حق را سوختن کارے بود

فرد از وے صاحبِ جذبِ کلیم ملّت از وے وارثِ ملکِ عظیم

دل کے رقص کو اپنا کر غیراللہ کے علاوہ تمام نقوش کو مٹانا بہت بڑا کام ہے جس سے ایک فرد تو کلیم اللہ کے جذب کا حامل بن جاتا ہے اور قوم ایک بہت بڑے ملک کی وارث بن جاتی ہے۔

یہ قوم فرہاد کی کوشش اور سعی و عمل کی وارث ہے ؎

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد

یہ ذوالقرنین کے ملک کی باسی قوم ہے اور اس پر خدا کے نبی آنحضور ﷺ (اُمّیوں کے علاوہ) مبعوث کئے گئے ہیں۔ یہی فکرِ عجم کا اسلامی اثاثہ ہیں' تاکہ اس کو اپنا کر اور فکرِ عجم کے منفی پہلوؤں سے پہلو تہی کر کے احیائے دین کا فریضہ ادا کر سکیں۔ اور بقولِ اقبال ؎

حرم کے پاس کوئی اعجمی ہے زمزمہ سنج کہ تار تار ہوئے جامہ ہائے احرامی

عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں شکوہ سنجر و فقر جنید و بسطامی

اگلے صفحات میں اس امر کی ایک عاجزانہ سی کوشش کی گئی ہے کہ فکر عجم کے اہم پہلوؤں کی نشان دہی کی جا سکی۔ حضرتِ علامہ اقبال نے اسی موضوع کو اپنے ڈاکٹریٹ کے لئے منتخب فرمایا تھا اور اسی پر راقم الحروف نے اپنی تمام تر بے بضاعتی کے باوجود خامہ فرسائی کی ہے۔ ممکن ہے کچھ خامیاں بھی ہوں اور کچھ اہم پہلو نظر سے چھپ بھی گئے ہوں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ علمی اور تاریخی خامیوں سے اعراض فرماتے ہوئے راقم الحروف کو اس سے آگاہ ضرور فرمائیں گے۔

قرآن عظیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام ہر مسلمان پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

KHALID TRADERS

NATIONAL DISTRIBUTORS NTN BEARINGS

IMPORTERS - INDENTORS - STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER - SMALL TO SUPER - LARGE

PLEASE CONTACT

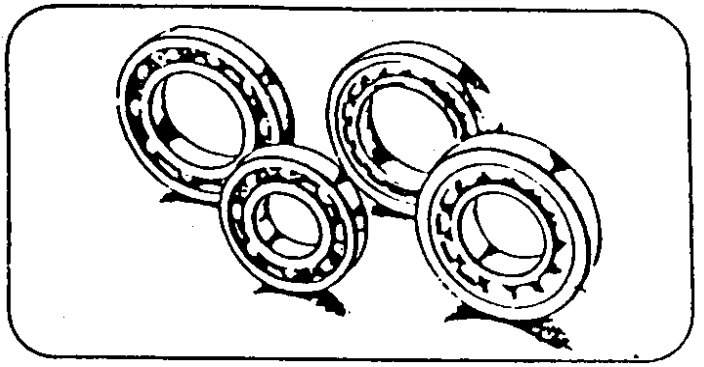

Opp. K.M.C. Workshop, Nishtar Road, Karachi-74200, Pakistan.

G.P.O. Box # 1178 *Phones* : 7732952 - 7730595 *Fax* : 7734776 - 7735803

E-mail : ktntn@poboxes.com

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : *SIND BEARING AGENCY*, 64 A-65 Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400(Pakistan) Tel : 7723358-7721172

LAHORE : 5 - Shahsawar Market, Rehaman Gali No. 4, 53-Nishtar Road, Lahore-54000, Pakistan. Phones 7639618,7639718,7639818, Fax: (42) : 763-9918

GUJRANWALA: 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING